روغنی پتلے
19172
ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company
ممتاز مفتی

ممتاز مفتی

الفیصل
ناشران و تاجران کتب
غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

انتساب

بانکی

بے باک

قلم کار

پروین عاطف

کے نام

ممتاز مفتی

ترتیب

☆

مشکل بات

اصل میں، میں پہلی بات لکھنا چاہ رہا تھا مگر یہ میرے لئے اتنا مشکل کام ہے کہ میں اسے آج سے مشکل بات ہی کا عنوان دیتا ہوں۔ ممتاز مفتی نے اپنی کسی کتاب میں لکھا ہے کہ چوہدری برکت علی اُن کے مربی اور محسن تھے جنہوں نے اپنی ذہانت سے بوجھ لیا تھا کہ ممتاز حسین ہی ممتاز مفتی ہے۔

یہی صلاحیت شاید ممتاز مفتی میں بھی در آئی تھی اور شاید انہوں نے بھی بہت پہلے بوجھ لیا تھا کہ اصل میں اُن کا قاری کون ہوگا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آج انہیں پڑھنے والا ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ ممتاز مفتی نے میرے لئے ہی کہانی لکھی ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ ایسا صرف اس لئے ہے کہ انہوں نے بڑی عام فہم اور آسان زبان میں وہ کچھ لکھ دیا جو حقیقت میں ہوتا ہے۔ انہوں نے روزمرہ واقعات کو علمی و ادبی رنگ دینے اور مشکل الفاظ کا جامہ پہنانے کی بجائے جو جیسا ہے ویسے ہی بیان کر دیا۔ یہی اُن کی انفرادیت ہے کہ بات سمجھ آتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں آج اگر وہ لاکھوں لوگوں کے دلوں میں اپنی تحریروں کی وجہ سے زندہ ہیں تو اس کی واحد وجہ یہی عام فہم ابلاغ ہے۔ یہی بات میں نے بھی اُن سے سیکھی کہ موثر اور جامہ ابلاغ ہی سب سے اہم ہے۔ بات سمجھ آنی چاہیے۔ عالم اپنی بات کسی جاہل کو نہ سمجھا سکے تو قصور جاہل کا نہیں۔

دوسری اہم بات کہ ممتاز مفتی کی کتابوں کی بے حد مانگ ہونے کی بنا پر اب اُن کی

تمام کتابوں کی اشاعت و تقسیم کا نیا انتظام کرتے ہوئے یہ ذمہ داری الفیصل ناشران، لاہور کو سونپی گئی ہے جو پہلے ہی اُن کی مقبول کتابوں "علی پور کا ایلی" اور "الکھ نگری" کے پبلشر ہیں۔

مجھے اُمید ہے کہ اب الفیصل ناشران کے تحت شائع ہونے والی کتب نہ صرف طباعت کے لحاظ سے معیاری اور جاذب نظر ہوں گی بلکہ قیمت اور ہر جگہ دستیابی کے حوالے سے بھی بہتری ہوگی۔

عکسی مفتی

جولائی ۲۰۰۸ء، اسلام آباد

میری بات

میری مشکل یہ ہے کہ میں دو ہوں۔ ایک نہیں بن سکا، کوشش کے باوجود نہیں بن سکا۔ اس لیے میرا مشاہدہ خام رہا۔ میں نے اسلوب کی پھول پتیاں ضرور سجائیں، جام پر نقش و نگار بنائے لیکن مشروب میں حقیقت کی تلخی، چاشنی مستی پیدا نہ کر سکا۔

گزشتہ ۴۸ سال میں میں نے سینکڑوں کہانیاں لکھیں لیکن وہ کہانی نہ لکھ سکا جو میں لکھنا چاہتا ہوں۔ مجھ میں وہ جوہر پیدا نہ ہوا جو قاری کا رُخ بدلنے پر قادر ہو۔

میرا دامن ''بیتیوں'' سے بھرا ہوا ہے لیکن میں انہیں کہانیوں میں نہ ڈھال سکا۔ خیال تھا کہ ''علی پور کا ایلی'' کی دوسری جلد میں ''بیتیوں'' کو پیش کروں گا۔ لیکن یہ منصوبہ ختم کرنا پڑا۔ اس لیے کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ قدرت اللہ شہاب کو بار بار بڑی عاجزی سے کہنا پڑے کہ ممتاز مفتی تو افسانہ نویس ہیں۔

قدرت اللہ کے عجز کے سحر سے بچ نکلنا کوئی آسان کام نہیں ہے دِقّت یہ ہے کہ میں نے زندگی میں جو کچھ بھی پایا ہے قدرت اللہ شہاب سے پایا ہے۔ روحانی طور پر مجھ میں صلاحیت کا فقدان تھا۔ پانا ممکن نہ تھا۔ دریا بہتا رہا۔ میں کنارے پر سُوکھا بیٹھا رہا۔

میرے نزدیک تحریر میں تاثر کو عطا سے تعلق ہے۔ میں نے حضرت دمڑی شاہ کی خدمت میں حاضری دی۔ عرض کی ''حضور آپ نے حضرت میاں محمود کو قلم عطا فرمایا تھا۔ کچھ مجھے بھی عنایت ہو جائے!''

دِلّی میں حضرت نظام الدین کے در پر دُھائی دی تھی کہ حضرت امیر خسروؒ کی جھولی بھری تھی۔ کچھ مجھے بھی دان کر دیجیے۔ بے شک وہ اہل تھے میں نا اہل ہوں لیکن عطا میں نہ

اہل ہوتا ہے۔ نہ نا اہل۔ بلکہ نا اہل ہوتو دین ''سچی'' دین بن جاتی ہے۔

اگر ان بزرگوں کی جانب سے عطا ہو جائے تو شاید مرنے سے پہلے میں وہ کہانی لکھ سکوں جو لکھنا چاہتا ہوں۔

میری زندگی میں افسانے نے کئی ایک چولے بدلے۔ پہلے ترقی پسندی کے تحت مزدور اور روٹی کپڑے کی بات چلی۔ ایسی چلی کہ فیشن بن گئی۔ سٹیٹس کا نشان بن گئی ہے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ میری تحریر بھی فیشنی ہو جائے، میرا بھی سٹیٹس بن جائے لیکن میں خود کو محدود نہ کر سکا۔ اس لیے ناکام رہا۔

پھر خیال افروز کہانیاں آئیں۔ جو سوچتی زیادہ تھیں۔ محسوس کم کم کرتی تھیں۔ سوچنا مجھ سے اپنایا نہ گیا۔ میرے نزدیک اب سوچ نہیں جذبات ہیں۔ جو انسان کو انسان کے قریب تر لے آتے ہیں۔

اب علامتی کہانی ''اِن'' ہے۔ اگر چہ وہ میری سمجھ میں نہیں آتی پھر بھی میں نے شدت سے کوشش کی کہ علامتی بن کر ''اِن'' ہو جاؤں۔ پھر ناکام رہا۔

ایک بات پر مجھے یقینِ محکم ہے کہ کہانی چاہے کتنے ہی رُوپ کیوں نہ بدلے، سب آتے جاتے ثابت ہوں گے۔ بالآخر اُسی کہانی کو قیام حاصل ہو گا جسے پڑھتے ہوئے قاری سوچے ''پھر کیا ہوا۔ اب کیا ہو گا؟''

پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ میں نے چند ایک برس کے لیے کہانی لکھنا چھوڑ دیا۔ ہُوا یُوں کہ میرے بیٹے عکسی نے مجھے سنجیدگی سے کہا ''ابو کہانی لکھنا بند کر دیں۔'' میں نے پوچھا ''کیوں؟'' کہنے لگا ''اس لیے کہ آپ آج کی نئی نسل سے قطعی طور پر واقف نہیں ہیں۔ صرف ''پراکسی'' سے سمجھتے ہیں۔'' ان دنوں عکسی گارڈن کالج میں لیکچرار تھا۔ وہ نئی نسل سے بہتر رابطہ رکھتا تھا۔ ویسے بھی مجھے عکسی کی سوچ پر بہت اعتماد تھا۔ وہ ظالمانہ حد تک حقیقت پسند ہے۔ میں نے کہانی لکھنی چھوڑ دی اور حلقہء اربابِ ذوق میں جا بیٹھا۔ حلقہ کے نوجوانوں نے مجھے بصیرت بخشی۔ جیسی کیسی بھی ہے۔ ان ہی کی دین ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں دعوہ دار ہوں کہ میری کہانیوں میں جاذبیت ہوتی ہے۔

نہیں ایسی بات نہیں۔ کسی کہانی میں اثر کی عطا ہو جاتی ہے۔ کسی میں نہیں۔ یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔ اس لیے اس مجموعے میں تیر بھی ہیں اور ''تکے'' بھی۔

میں نے ۱۹۳۶ء میں کہانی لکھنے کی ابتداء کی تھی۔ اس دوران میں میری تحریر نے کئی ایک رُوپ بدلے، زاویے بدلے، رُخ بدلے۔ اسلوب نے رنگ بدلے انداز بدلے۔ یہ میرا چھٹا مجموعہ ہے۔

مجھے ایک زعم ضرور ہے۔ میں نے ہمیشہ حتی الوسع کوشش کی ہے کہ اظہار میں رسمی بیان نہ آئے، بات میں سادگی ہو، روانی ہو، سچائی ہو، میری تحریر میں کتابی رنگ پیدا نہ ہو۔ کہانی لکھی جائے، کہی جائے، سنائی جائے۔

یہ کہانیاں لکھ کر میں نے اُردو ادب کی کوئی خدمت نہیں کی، اُلٹا اُردو ادب نے مجھ پر احسان کیا ہے کہ مجھے گوارا کیا۔

میں نئی نسل کا احسان مند ہوں کہ انھوں نے مجھے اپنایا۔

حلقۂ اربابِ ذوق، سلسلہ اور رابطہ کا شکر گزار ہوں کہ میرا حوصلہ بندھایا۔

ممتاز مفتی

مکان 22، گلی 32، سیکٹر ایف 6-1

اسلام آباد

-☆-

سُندرتا کا راکشس

شام دبے پاؤں رینگ رہی تھی۔

ٹیلے پر درختوں کے سائے پھیلتے جا رہے تھے لیکن چوٹی کی جھولی سورج کی تھکی ماندی کرنوں سے ابھی تک بھری ہوئی تھی۔

سوامی جی کی کٹیا کا دروازہ صبح سے بند تھا۔ بالکا اور داس دونوں درختوں کی چھاؤں تلے بیٹھے اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ ہر چند ساعت بعد وہ سر اُٹھا کر سوامی جی کی کٹیا کے دروازے کی طرف اُمید بھری نگاہوں سے دیکھتے کہ کب دروازہ کھلے اور درشن کے بھاگ جاگیں لیکن دروازہ نہیں کھلا تھا۔

صبح داس نے تھالی میں بھوجن پروس کر سوامی جی کے دروازے پر رکھ دیا تھا لیکن اب تک تھالی جوں کی توں دھری تھی۔ نہ دروازہ کھلا نہ سوامی جی نے بھوجن اُٹھایا۔ اب وہ رات کے بھوجن کی تیاری میں لگا ہوا تھا۔

پاس ہی بالکا مُنجھ کے بنے ہوئے جوتے کی مُرمت کر رہا تھا۔

دُور ٹیلے کے مغربی کونے کے پرے شہر کے مکانات صاف دکھائی دے رہے تھے جیسے ماچس کی روغنی ڈبیاں نیچے اُوپر دھری ہوں۔ شہر کے لوبھی بھنورے کی مدھم بھن بھن صاف سُنائی دے رہی تھی۔

دفعتہً داس کے منہ سے اک چیخ سی نکلی۔ ”ہے رام!“ اور چاقو اس کے ہاتھ سے گر گیا۔

”ہاتھ کٹ گیا کیا“۔ بالکے نے سر اُٹھا کر پوچھا۔

''ناہیں مہاراج، وہ دیکھو۔۔۔اُدھر''۔

بالکے نے اُوپر دیکھا، اس کی آنکھیں کھلی کی کُھلی رہ گئیں۔ ٹیلے کے مغربی کنارے پر دو لڑکیاں اُن کی طرف آ رہی تھیں۔ چست لباس پہنے، بال پھُلائے، مُکھ سجائے، پرس جھُلاتی ہوئی، یوں جیسے وہ سوامی جی کا آشرم نہیں بلکہ پکنک سپاٹ ہو۔

''یہ تو کالج کی دِکھتی ہیں مہاراج'' داس نے کہا۔

''آج کل تو سبھی کالج کی دِکھتی ہیں، بالکے نے جواب دیا، کیا ماتا کیا پُتری'' بالکا اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور گھبراہٹ میں ٹہلنے لگا۔

داس چھلے ہوئے آلوؤں کو پھر سے چھیلنے میں لگ گیا۔ ٹیلے پر گھبراہٹ بھری خاموشی کے ڈھیر لگ گئے۔

وقت تھم گیا۔

پھر ایک لوچ دار آواز نے تتلی کی طرح پر پھڑ پھڑائے۔ ''ہمیں سوامی جی سے ملنا ہے''۔

بالکے نے سر اُٹھایا۔

شیلا اور بملا کی کٹوراسی کھلی کھلی آنکھیں دیکھ کر بالکے نے گھبرا کر سر جھکا لیا اور بولا ''سوامی جی کی کٹیا کے دوار کے پٹ کل سے بند ہیں دیوی۔ انہوں نے صبح کا بھوجن بھی نہیں اُٹھایا''۔

''تو دوار کے پٹ کھول دو۔'' شیلا بولی۔

''ہمیں اس کی آگیا نہیں دیوی۔''

''سوامی جی کو بھی تو دوار بند کرنے کی آگیا نہیں''۔ بملا غصے میں چلائی۔ ''اگر پرماتما کا دوار بھی بند ہو گیا تو منگتوں کا کیا ہوگا؟''

یہ سن کر بالکے کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ سُدھ بُدھ ماری گئی۔ اب کیا جواب دے کوئی ہو تو دے ٹیلے پر خاموشی طاری ہو گئی۔

پھر داس اُٹھا، اس نے لپک کر چٹائی اُٹھائی اور کنیاؤں کے سامنے بچھا کر نیچی نگاہوں

سے بولا۔ ''بیٹھو شریمتی بیٹھو۔''

''ہمارے پاس بیٹھنے کا ٹائم نہیں۔'' شیلا نے کہا۔

''سوامی جی سے کوئی مانگ کرنا ہے یا پوچھنا ہے''۔ داس نے پوچھا۔

''مانگ بھی، پوچھنا بھی'' شیلا نے کہا۔

''ہم تمہارا اسندیس پہنچادیں گے دیوی'' بالکا بولا۔

''اُوں ہُوں''۔ شیلا نے تیوری چڑھا کر کہا ''ہم خود سوامی جی سے بات کریں گے۔''

''پر دیوی جی، سوامی جی استریوں سے نہیں ملتے'' بالکے نے کہا۔

''کیا کہا؟'' شیلا اور بملا دونوں چلاّئیں۔

''کیا وہ پرش اور استری کو برابر نہیں جانتے؟'' شیلا نے تلخی سے پوچھا۔

بالکے نے سر لٹکا لیا اور چُپ سادھ لی، اب وہ کیا کہے کیا جواب دے۔

ٹیلے پر پھر خاموشی چھا گئی۔ گہری لمبی خاموشی۔

آخر شیلا زیر لب بولی۔ جیسے خود سے کہہ رہی ہو۔ اُس کی آواز میں مایوسی کی جھلک تھی۔ ''بیکار ہے بملا، استری کے لیے پرماتما کا دوار بھی بند ہے۔ یہاں بھی اندھیر نگری ہے۔ یہ ویش بھی پُرش کا ویش نکلا۔''

بملا کا چہرہ غصے سے سُرخ ہو گیا۔ وہ چلاّ کر بولی ''سوامی جی پُرش سے ملتے ہیں استری سے نہیں۔ کیا سوامی جی اِستری سے ڈرتے ہیں۔''

بالکے نے جواب دیا ''اِستری سے سوامی جی نہیں ان کے اندر کا پُرش ڈرتا ہے اور پُرش استری سے نہیں خود سے ڈرتا ہے۔ اس میں اتنی شکتی نہیں دیوی کہ وہ اندر کے مرد کو روک میں رکھ سکے۔''

یہ سن کر کنیائیں سوچ میں پڑ گئیں۔

اس سمے داس نے دو پیالے چائے کی تھالی میں دھرے اور کنیاؤں کے سامنے رکھ کر بولا:

''دیوی چائے پیو تم تھک گئی ہوگی۔ بڑی کٹھن چڑھائی ہے اس ٹیلے کی۔''

''مجھے دیوی نہ کہو، شیلا غصے میں بولی ''میں دیوی نہیں استری ہوں، استری۔''

''بی بی یہ تو ہمارا اندر کا کھوٹ ہے''۔ بالکے نے کہا'' کہ استری سے بچنے کے لیے ہم اسے دیوی بنا لیتے ہیں۔''

''تمہارے اندر بھی کھوٹ ہے کیا؟ تم جو دن رات رام نام کی دُھنکی سے دل کو پوتر کرنے میں وقت گزارتے ہو'' بملا نے پوچھا۔

''دیوی'' بالکا بولا'' من کا کھوٹ کنویں کے پانی کی طرح ہوتا ہے جتنا نکالو اتنا ہی بھیتر سے رس کر باہر آ جاتا ہے۔''

یہ سن کر وہ دونوں چُپ ہو گئیں۔ دفعتہً انھوں نے محسوس کیا کہ وہ بہت تھک گئی ہیں۔ اس لیے چٹائی پر بیٹھ کر چائے پینے لگیں۔

''ہاں'' شیلا سوچ میں گم بڑبڑائی ''میرے پتی نے بھی مجھے دیوی بنا رکھا تھا۔ اتنا پیار کرتا تھا کہ وہ پوجا لگتی تھی۔ میں کہتی پر کاش مجھے دیوی نہ بناؤ، مِتر بناؤ۔ ساتھی بناؤ، برابر کا ساتھی۔۔۔''

''اُوں ہُوں'' بملا نے آہ بھری ''وہ برابر کا نہیں جانتے ساتھی نہیں مانتے۔ یا تو دیوی بنا کر پوجا کرتے ہیں اور یا باندی سمجھ کر حکم چلاتے ہیں۔''

''ایسا کیوں ہے بالکا جی'' بملا نے پوچھا۔

''کیا سوامی جی سے یہی پوچھنے آئی ہو دیوی'' بالکے نے کہا۔

''ہاں'' شیلا بولی ''جب پُرش اور استری ایک گاڑی کے دو پہیے ہیں تو پھر بڑا چھوٹا کیوں۔''

''سچ کہتی ہو شریمتی سچ کہتی ہو'' بالکے نے آہ بھری ''یہ تو استری کی جنم جنم کی پکار ہے۔ اس دن سے استری برابری کی بھیک مانگتی پھرے ہے جس دن رانی وجے ونتی نے راج پاٹ کو تیاگ کر برابری کے کھوج میں راج بھون سے پاؤں باہر دھرا تھا''۔ یہ کہہ کر بالکا چپ ہو گیا۔

''وجے ونتی کون تھی بالکا جی'' بملا نے پوچھا۔

''تمہیں نہیں پتہ کیا'' بالکا بولا '' آج بھی راج گڑھی کی ڈھیری میں آدھی رات کے وقت رانی وجے ونتی کی آواجیں سنائی دیتی ہیں۔''

''آج بھی'' بملا نے پوچھا۔

''ہاں آج بھی۔ اس کی ڈھونڈ آج بھی جاری ہے۔''

یہ سن کر شیلا بملا کو چپ لگ گئی۔

سائے اور بھی لمبے ہو گئے۔

درختوں کی ٹہنیاں ایک دوسرے سے لپٹ لپٹ کر رونے لگیں۔ سورج کے لہو نے رِس رِس کر بادلوں کو رنگ دیا۔

وقت رُک گیا۔

پھر شیلا کی مدھم آواز آئی '' بالکا جی، وجے ونتی کون تھی؟''

اور پھر بالکے نے وجے ونتی کی کہانی سنانی شروع کی۔ بالکا بولا۔ وجے ونتی راج گڑھی کے مہاراج ماتری راج کی رانی تھی۔ مہاراج کا سنگھاسن اس کے چرنوں میں دھرا تھا۔ مہاراج اسے آنکھوں پر بٹھاتے۔ وارے نیارے جاتے۔۔۔ اس کی کوئی بات نہ ٹالتے۔ اُلٹا پلّے باندھ لیتے انہیں وجے سب رانیوں سے پیاری تھی۔ کیسے نہ ہوتی۔ سُندرتا میں وہ سب سے اُتم تھی۔ صرف ناک نکسہ ہی نہیں۔ اس کی چال ڈھال، رنگ رُوپ سبھاؤ بھی کچھ سندرتا میں بھیگا ہوا تھا۔ پلکیں اُٹھاتی تو دیئے جل جاتے۔ ہونٹ کھولتی تو پھول کھل اُٹھتے۔ بانہہ ہلاتی تو ناگ جھولتے۔ بھرپور نجر سے دیکھتی تو رنگ پچکاری بھگو کر رکھ دیتی۔ مہارانی راج بھون میں بڑے آنند سے جیون گجار رہی تھی۔

بالکا رُک گیا۔ پھر کچھ دیر کے بعد بولا۔ پھر ایک روز آدھی رات کے سمے مہارانی کا دوار بجا وہ سمجھی مہاراج آئے ہیں۔ اُٹھ کر دوار کھولا تو کیا دیکھتی ہے کہ مہاراج نہیں بلکہ ایک بوڑھی کھوسٹ استری کھڑی ہے۔

کون ہے تو؟ وہ غصے سے چلاّئی۔

اس کی آواج سن کر مہارانی کی باندی شوشی جاگ اُٹھی اور دوڑ کر دروازے پر آ گئی۔

اس کی اتنی جان کہ آدھی رات کو مہارانی کا دوار کھٹکھٹائے۔ رانی نے شوشی سے کہا۔ کون ہے تو؟ شوشی بڑھیا کی طرف جھپٹی۔

میں شوبالا ہوں۔ بڑھیا نے جواب دیا۔ میرا دارو کھتم ہو گیا ہے۔ دارو بنا میری رات نہیں کٹے گی۔ میں نے سوچا کہ رانی کے آگے جھولی پھیلاؤں جو کرپا کریں تو میری رات کٹ جائے۔

تو استری ہو کے دارو پیتی ہے۔ رانی نے گھن کھا کر جھرجھری لی۔

نہ مہارانی، جو میں استری ہوتی تو دارو پینے کی کیا جرورت تھی۔ جب میں استری تھی تو دارو نہ پیتی تھی۔ پلایا کرتی تھی۔ لیکن اب۔ اب میں وہ دن بھولنے کے لیے دارو پیتی ہوں۔

یہ کیا بول رہی ہے شوشی۔ وجے نے کہا کہتی ہے میں استری نہیں۔

شوبالا بولی۔ استری ایک سوگند ہوتی ہے جو کچھ دِناں رہتی ہے پھر اُڑ جاتی ہے اور پھر پھول کی جگوں ڈنٹھل رہ جاتا ہے۔

تو راج بھون کی باندی ہے کیا؟ شوشی نے پوچھا۔

نہیں شوبالا نے کہا۔ میں باندی نہیں ہوں۔ آج سے تیس ورش پہلے میں بھی اسی رنگ بھون میں رہتی تھی۔ اسی دالان میں جس میں تُو رہتی ہے۔ اسی سیج پر سوتی تھی جب مہاراج ماتری راج کے پِتا راج سنگھاسن پر براجمان تھے۔ مہاراج مجھے آنکھوں پر بٹھاتے تھے جیسے تجھے آج بٹھاتے ہیں۔ بات منہ سے نکلتی تو پورن ہو جاتی۔ یہ سب چونچلے سُندرتا کے کارن تھے۔ جیسے آج تیرے چاؤ چونچلے ہیں۔ پھر ایک دن آئے گا، جب تو بھی ان دنوں کو بھولنے کے لیے دارو کا سہارا لے گی۔

یہ سُن کر وجے کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ تو کیا یہ ساری چاننی رُوپ کی ہے؟ میں کچھ بھی نہیں؟

کچھ بھی نہیں۔ شوبالا نے جواب دیا۔ جب تک دُکان سجی ہے۔ گاہکوں کی بھیڑ ہے۔ جب دکان لُٹ جائے تو استری کو کون جانے ہے مہارانی۔

تو بکتی ہے یہ سب جھوٹ ہے۔ وجے نے چیخ کر کہا۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ نہیں ہو سکتا۔

بالکا رک گیا۔

داس نے چونک کر دیکھا۔ توے پر پڑا ہوا پھلکا جل کر کالا ہو گیا تھا۔

بملا سر جھکائے چٹائی کو کُرید رہی تھی۔

شیلا کی نگاہ چلتے بادلوں پر ٹکی ہوئی تھی۔

''پھر کیا ہوا بالک مہاراج''۔ داس کی آواز سن کر وہ سب چونک پڑے۔

بالکے نے بات چلا دی۔ بولا۔

شوبالا کے جانے کے بعد وجے رانی بے کل ہو گئی۔ کیا یہ سچ ہے کہ سندرتا ہی سبھی کچھ ہے؟ استری کسی گنتی میں نہیں؟ نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ جھوٹ ہے۔ شوشی نے اسے بہت سمجھایا۔ مہارانی سچ کے کھوج کی لگن نہ لگا۔ سچ کوئی میٹھا پھل نہیں۔ وہ جھوٹ جو شانت کر دے اس سچ سے اچھا ہے، جو اندر بھٹی سُلگا دے ہے۔ پرنتو مہارانی کو سچ کی ڈھونڈ کا تاپ چڑھا تھا۔ بولی منش کی رتھ میں دو پہیئے لگے ہیں۔ پُرش اور اِستری۔ رتھ کیسے چل سکتی ہے جد تو ڑی دونوں پہیئے برابر نہ ہوں۔

نہیں رانی۔ شوشی نے کہا۔ یہ پہیئے برابر نہیں۔ کارن یہ کہ پُرش کا پہیہ چلے ہے۔ استری کا کھالی سجاوٹ کے لیے ہے۔ چلتا نہیں۔

باندی نے وجے کو بہت سمجھایا پر وہ نہ مانی۔ بالکا رک گیا۔ پھر اس نے سر اُٹھا کر بملا شیلا کی طرف دیکھا۔ بولا ''کنیاؤ! جس کے من میں سچ کی ڈھونڈ کا کیڑا لگ جائے پھر جیون بھر اُسے نہ سُکھ ملتا ہے نہ شانتی۔''

''یہ کیا کہہ دیا بالک مہاراج۔'' داس بولا۔

دوارکا داس بالک نے کہا ''سچ بولو، سچ کو اپناؤ، سچ جیو، پرنتو سچ کی ڈھونڈ میں نہ نکلنا، سدا چلتے رہو گے۔ چلنے کے پھیر میں آ جاؤ گے۔ نہ رستہ ہو گا۔ نہ ڈنڈی نہ اور۔ نہ کہیں پہنچو گے۔ صرف چلنا چلتے رہنا۔'' بالکے نے آہ بھری اور کہانی سنانے لگا۔ بولا۔ لاکھ سمجھانے پر بھی وجے رانی سچ کی ڈھونڈ میں چل نکلی۔ سب سے پہلے اس نے مہاراج کو پرکھنے کی ٹھانی کہ وہ مجھے برابر کا جانیں ہیں کہ نہیں۔ اس کے من میں چنتا کا کانٹا لگ گیا۔ جوں جوں اس

کی چنتا بڑھتی گئی توں توں مہاراج اسے اپنے دھیان کی گود میں جُھلاتے گئے اس کے سامنے یوں سیس نواتے گئے جیسے وہ سچ مُچ کی دیوی ہو۔ جُوں جُوں وہ دیوی کو مناتے گئے تُوں تُوں رانی کی کلپنا بڑھتی گئی۔ مہاراج مجھے مورتی نہ بنایئے، مندر میں نہ بٹھایئے، اپنے پاس بٹھایئے۔ اپنے برابر جانئے۔

مہاراج کو سمجھ میں نہ آتا تھا کہ برابر کیسے جانیں، جسے دھیان دیا جائے، مان دیا جائے، اونچا بٹھایا جائے، وہ برابری کیوں چاہے۔ جسے سارا دیا جائے وہ آدھا کیوں مانگے۔

وجے رانی کو جلد ہی پتہ چل گیا کہ مہاراج اسے دیوی کے سمان بنا سکتے ہیں، مہارانی بنا سکتے ہیں چہیتی سمجھ سکتے ہیں، ساتھی نہیں بنا سکتے۔

یہ جان کے وجے نے ٹھان لی کہ وہ راج بھون کو چھوڑ دے گی۔ رانی نہیں بلکہ استری بن کر جیئے گی۔ سندرتا کے جوار پر نہیں، جیو کے جور پر بھبھوت مل کر سُندرتا چھپائے رکھے گی اور کسی کے ساتھ بیاہ نہ کرے گی جب تک وہ اسے برابر کی نہ سمجھے۔ ساتھی نہ جانے۔

پھر ایک رات جب گرج چمک جوروں پر تھی اور راج بھون کے چوکیدار کونوں میں سہمے بیٹھے تھے تو وجے نے بھیس بدلا اور شوشی کو ساتھ لے کر چور دروازے سے باہر نکل گئی۔

چلتے چلتے وہ راج نگری سے دُور ایک شہر میں رُکیں۔ وجے گجارے کے لیے پُھلکاریاں بناتی۔ شوشی انھیں باجار جا کر بیچ دیتی۔

کچھ دنوں میں وجے کی پُھلکاریوں کی مانگ بڑھ گئی اتنی صاف ستھری پھلکاریاں کون بناوے ہے۔ منڈی میں باتیں ہونے لگیں۔ پھر بدیش سے ایک گبھرو بیوپاری آنند آ نکلا پھلکاریاں دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ اس نے شوشی کو ڈھونڈ نکالا۔ بولا یہ پھلکاریاں کون کاڑھتی ہے مجھے اس کے پاس لے چل۔ شوشی اسے گھر لے آئی۔ وجے کو دیکھ کر وہ پُھلکاریاں بھول گیا۔ وجے پھلکاریاں دکھاتی رہی۔ آنند وجے کو دیکھتا رہا۔ وجے سمجھتی تھی کہ بھبھوت سندرتا کو ڈھانپ لیتی ہے۔ آنند سوچتا رہا کہ جس گُن کو استری اُچھالتی ہے یہ شریمتی اسے چھپا رہی ہے۔ اوش کوئی بھید ہے۔

آنند بہت سیانا تھا۔ اس نے شہر شہر کا پانی پی رکھا تھا۔ اس نے سوچا پاؤں دھیرے دھیرے دھرو۔ بڑی پھسلن ہے اور جو گرا تو یہاں سہارا دے کر اُٹھانے والا کوئی نہیں۔ پہلے تیل دیکھ، تیل کی دھار دیکھ۔ پھر پاؤں دھرنا۔ تو وہ تیل کی دھار جانچنے کے لیے پھلکاریوں کے بہانے وجے کے گھر آنے جانے لگا۔

دو چار پھیروں میں اُسے پتہ چل گیا کہ سندرتا کی بات نہیں چلے گی۔ پریم کی بات نہیں چلے گی۔ ملائم بات نہیں چلے گی۔ لگاؤ کی نہیں، بے لاگ، کھردری، گنوار۔

وہ بولا۔ بی کاڑھن تُو تو چیونٹی کی چال چلے ہے پر مجھے تو بہت سی پھلکاریاں چاہئیں تاکہ انہیں بیچ کر اپنا پیٹ پال سکوں۔

پھر چار ایک دن کے بعد آنند، وجے سے بہت بگڑا۔ سب جھوٹ موٹ۔ بولا۔ تو کام چور ہے ری۔ میں تیرے سر پر بیٹھ کر کام کراؤں گا۔ اس بہانے وہ سارا سارا دن وجے کے گھر رہنے لگا جوں جوں وہ اس کے نیڑے ہوتا گیا، اس کا من ہاتھوں سے نکلتا گیا۔

پھر ایک دن آنند نے اس کی بانہہ پکڑ لی۔ بولا۔ بی کاڑھن میرا دھندا نہیں چلتا اتنی کمائی بھی نہیں ہوتی کہ سوکھا گجارہ کر سکوں۔ جو تو مجھ سے بیاہ کر لے۔ تو جیون سُکھی ہو جائے۔ تو پھلکاریاں کاڑھے میں انہیں بیچوں۔ کام تیرا دوڑ دھوپ میری۔

وجے اس کی چال میں آ گئی۔ اس کی ممتا جاگ اٹھی۔ بولی، میں تو اس سے بیاہ کروں گی جو پتنی کو برابر کا سمجھے، نہ اُسے دیوی بنائے نہ باندی۔ اپنا ساتھی جانے دُکھ سُکھ کا ساتھی۔

ٹھیک ہے، آنند بولا۔ تو میری ساتھن ہے۔ ساتھن رہے گی۔

جب وجے دُلہن بنی تو بھبھوت کا پردہ بھی اُٹھ گیا۔ اندر سے رانی نکل آئی۔ آنند تو دھک سے رہ گیا۔ ہے پربھو ایسی مورتی! بالکا رُک گیا۔

داس منہ کھولے بیٹھا تھا۔ چولہا جل رہا تھا۔ توا جو کھالی پڑا تھا، تپ تپ کر کالا ہو گیا تھا۔ پیڑا ہاتھ میں یوں دھرا تھا جیسے بالک کے ہاتھ کا کھِد وہو۔

شیلا کی نگاہیں گھاس پر بچھی ہوئی تھیں جیسے ڈھونڈ میں لگی ہوں۔ بملا کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں اب روئی کہ اب روئی۔

ٹیلے پر سایے منڈلا رہے تھے۔ بادلوں میں آگ جل رہی تھی۔

شام دبے پاؤں جا رہی تھی۔ رات اپنے پر پھڑ پھڑا رہی تھی۔

''پھر کیا ہوا بالک جی؟'' داس نے جیسے ہچکی لی۔

بالک بولا۔ ''آنند بہت بڑا سوداگر تھا۔ حویلیاں تھیں، نوکر چاکر تھے۔ دھن دولت تھی۔ کس بات کی کمی تھی اسے۔ وہ تو وجے کو رام کرنے کے لیے اس نے نردھن کا سوانگ رچایا تھا۔ بس ایک بات سچ تھی۔ وہ تن من دھن سے وجے کا ہو چکا تھا۔

اس کا باہر جانے کو جی نہیں چاہتا تھا پر کیا کرتا۔ اتنا بڑا بیوپار تھا۔ اس کی دیکھ بھال تو کرنی ہی تھی۔ اسے جانا ہی پڑتا۔ پھلکاریاں بیچنے کے بہانے چلا جاتا۔ دنوں باہر رہتا چلا جاتا تو جیسے گھر کا دھیان ہی نہ ہو۔ آ جاتا تو جیسے جانے سے ہَول کھاتا ہو۔

پھر یہ بھی احساس تھا کہ اس نے وجے کو پھلکاریاں کاڑھنے سے روک دیا تھا۔ بولا۔ پتنی تو سال میں ایک ٹھاٹھ کی پُھلکاری بنا دیا کر، ایسی جو راجا رانی جوگی ہو۔ ایسی جو ایک بیچ لی تو گھر میں لہر بہر ہو گئی۔

اس پر وجے سوچ میں پڑ گئی۔ سوچتی رہی سوچتی رہی۔ جب وہ آیا تو اسے کہنے لگی۔ رے تو مجھ سے اپنے بیوپار کی بات کیوں نہیں کرتا۔

آنند نے جواب دیا۔ ساتھن بیوپار میں اونچ نیچ ہوتی ہے۔ پھن پھریب ہوتا ہے۔ چھل بٹے ہوتے ہیں۔ بیوپار کی بات سن کر کیا کرے گی۔

وجے بولی دیکھ میں تیری ساتھن ہوں۔ برابر کی ساتھن۔ اور ساتھی کھالی سُکھ کا نہیں ہوتا۔ دُکھ کا بھی ہوتا ہے۔ اونچ کا نہیں، نیچ کا بھی ہوتا ہے۔ تو مجھے اپنے بیوپار کی ساری بات بتا۔ اپنے دُکھ گنوا۔

اس پر آنند نے اُسے ایک لمبی چوڑی طوطا مینا کہانی سُنا دی کہ کس طرح وہ نگر نگر پھرا۔ راجاؤں رانیوں سے ملا۔ اُنھیں پھلکاری دکھائی۔ اور انت میں اک راج نرتکی پھلکاری کو دیکھ کر اس پر لٹو ہو گئی۔ بولی۔ بول بیوپاری منہ مانگے دام دوں گی۔

اس رات ونجے کو یوں لگا جیسے آنند اس کا جی بہلانے کے لیے کہانی سُنا رہا ہو سُلانے

کے لیے لوری دے رہا ہو۔ اس پر وہ سوچ میں کھو گئی۔ من میں گھنڈی پڑ گئی بولی شوشو یہ تو وہ نہیں جو یہ کہے ہے۔ جو بھید ہی نہ دے وہ ساتھی کیا بنے گا۔

دیکھ رانی۔ شوشی بولی۔ وہ اوش بھید رکھے ہے پر اس کے من میں دوج نہیں کھوٹ نہیں۔ پُرش، پتنی کو اپنے بیوپار کا بھید کبھی نہیں دیتا وہ اسے ساری بات کبھی نہیں بتاتا؟ جرور ڈنڈی مارے ہے۔ یہی جگ کی ریت ہے۔

تو کیا وہ استری کو اس جوگا نہیں جانتا کہ ساری بات جانے۔ یہ تو ساتھ نہ ہوا، برابری نہ ہوئی۔ جا شوشو منڈی میں جا کر پوچھ پگھ کر۔ اس کے بھید کا پتہ لگا۔

شوشی نے پوچھ پگھ کی۔ تو پتہ چلا کہ آنند تو ایک راج بیوپاری ہے۔ اسے نے بیجانگری کی مہارانی کے لیے شیش بھون بنوانے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔

جب وجے نے یہ سُنا تو اس کا دل ٹوٹ گیا تو پھلکاریاں بیچ کر گجارہ کرنے کی بات اک بہانہ تھی۔ کیوں شوشی، تو کیا کہتی ہے؟

شوشی نے وجے کو بہت سمجھایا بجھایا کہ دیکھ دئیا! اس سے اچھا جیون ساتھی تجھے نہیں ملے گا۔ اس سے جیادہ برابری کوئی نہ دے گا۔ لیکن وجے نہ مانی۔ شوشو اتنے پردے اوپر بچھ، بھیتر کچھ۔ نہ شوشی جہاں پردے ہوں، جھوٹ ہو، دکھاوا ہو وہاں برابری کیسی۔ چل شوشی کسی ایسی جگہوں چلیں جہاں پردہ نہ ہو، جھوٹ نہ ہو، اب یہاں میرا دم گھٹتا ہے۔ بالکا رُک گیا۔

''تو کیا وجے آنند کو چھوڑ کر چلی گئی؟'' شیلا نے پوچھا۔

''ہاں، چلی گئی'' بالکا بولا۔

بملا نے ایک لمبی آہ بھری۔

''پھر وے کہاں گئی؟'' داس نے پوچھا۔

پہلے وہ ایک پجاری کے پھندے میں پھنس گئی۔ پجاری نے اسے داسی بنا لیا، پربھو کی داسی، پھر آپ پربھو بن بیٹھا۔

وہاں سے بھاگی تو ایک نرتکی کے جال میں جا پھنسی۔ اس نے اسے اپنے چوبارے میں سجا لیا۔ چوبارے سے اسے ایک راج گایک لے اُڑا وہاں بھی اسے برابری نہ ملی۔

گا یک سارا دن ستار سینے سے لگائے رکھتا۔ پھر تھک کر ماندگی اُتارنے کے لیے وہ وجے سے دل بہلاتا۔

چل شوشی، ایک دن وجے نے کہا۔ یہاں تو راگ ودھیا کا راج ہے۔ شوشی بولی۔ دئیا جو تو چاہے ہے وہ ادھر نہیں ملے گا جہاں دھنوان بستے ہیں۔ وہ ادھر ملے گا جہاں نردھن بستے ہیں، کامی بستے ہیں۔ جہاں پُرش پتنی کا سہارا لیے بغیر کچھ کر نہیں سکتا جہاں پتنی نہ موہ ہوتی ہے نہ مایا۔ بس اک باجو ہوتی ہے۔ پہلے سہارا ہوتی ہے پھر کچھ اور۔ جہاں دوجے کے بنا گجارا نہیں ہوتا۔ وہاں استری کو برابری مل جائے تو مل جائے۔

وہ کون سی جگہوں ہے، کہاں ہے شوشی۔ وجے نے پوچھا۔

وہ جگہ وہاں ہے۔ جہاں دھن کا جور نہیں ہوتا کام کا ہوتا ہے۔ دیکھو دیّا تو مان نہ مان پرنتو استری جیو کی دھرتی ہے جس کے دم سے جیو کونپل ہری رہتی ہے۔ استری کی سار وہی جانے ہے۔ جو دھرتی کی سار جانے ہے۔ جو بوٹا لگانا جانے ہے جو کھیتی اُگائے ہے۔ جس کا گجارا دھرتی کی پیداپر ہے بس وہی استری کو باجو سمجھے ہے۔ اپنے سا جانے ہے۔

وجے کے دل میں بات اُتر گئی۔

اک بار پھر وہ گھر چھوڑ کر نکل گئیں۔ شہر سے دُور گاؤں کی اور۔

شوشی نے وجے کو موٹے کپڑے پہنا دیئے۔ منہ پر ہلدی، کالک کا اُبٹن مل دیا۔ بولی یہاں استری، استری ہوتی ہے۔ گُن کے جور پر نہیں۔ جیو کے جور پر۔ یہاں سندرتا شوبھا نہیں رستے کی روک ہے۔ تو اپنی سندرتا کو چھپا رکھنا۔ جو نجر آ گئی تو گڑبڑ ہو گی۔

شوشی۔ وجے بولی۔ میں اس سندرتا کے کارن بڑی دکھی ہوں۔ کوئی وِس بھری بوٹی ڈھونڈ لا کہ میں مکھ پر مل لوں جو سندرتا کی کاٹ کر دے۔

شوشی ہنسی۔ بولی، بھولی رانی سُندرتا مکھ پر نہیں ہوتی۔ سارے پنڈے میں ہوتی ہے۔ انگ انگ سے پھوٹتی ہے۔ ہاتھ ہلانے میں ہوتی ہے۔ پگ دھرنے میں ہوتی ہے۔ آنکھ اٹھانے میں ہوتی ہے۔ ہونٹ کھولنے میں ہوتی ہے۔ تو اسے اپنے سبھاؤ سے کیسے نچوڑ پھینکے گی۔

گاؤں میں پہنچ کر انہوں نے ایک جھگی میں ڈیرا کر لیا اور کھیت میں کپاہ کے پھول چُننے لگیں۔

ایک دن لاکھا کسان نے وجے سے کہا تو کیسی جنانی ہے ری۔ تیری انگلیاں تو قینچی سی چلتی ہیں۔ اس نے وجے کا ہاتھ پکڑ لیا۔ انگلیاں دیکھیں تو ٹھٹکا گیا۔ ری یہ کیسی انگلیاں ہیں۔ انگلیاں ہیں کہ رسی بھری پھلیاں۔ اتنی لمبی اتنی پتلی۔

پھر وہ روز اس کی چلتی چُنتی انگلیاں دیکھنے لگا۔ دیکھتے دیکھتے ایک دن انگلیاں پکڑ کر بولا۔ ری تو میرے گھر کیوں نہیں بیٹھ جاتی۔ میں اکیلا ہوں۔ پتا جی پرماتما کو پیارے ہو گئے۔ ماتا بہت بوڑھی ہے میرا ہاتھ نہیں بٹا سکتی۔ بھائی بہن ہیں نہیں اکیلا ہوں تو میرا با جو بن جا ری۔ میں ہل چلاؤں گا تو بیج ڈال۔ میں پانی دوں تو کھیت کی بوٹی چُن۔ میں گیہوں کاٹوں تو دانے نکال۔ پھر ہم کسی سے ہیٹے نہیں رہیں گے۔ میں جو آدھا ہوں پورن ہو جاؤں گا۔ اس کی بات میں نہ موہ تھی نہ کامنا۔ نہ لوبھ۔

وجے کو اپنی شرط بھی بھول گئی۔ اس نے ہاں کر دی۔ پھر وہ دونوں کھیت پر کام میں جُت گئے۔ لاکھا نہ اسے نرلی سمجھتا تھا نہ ماڑی۔ نہ سندر نہ دیوی۔ وہ تو اس کا باجو تھی۔ پھر کوئی بات اس سے چھپاتا بھی تو نہ تھا۔ کیسے چھپاتا۔ ہر سمے وہ دونوں اکٹھے رہتے۔ کھیت میں۔ گھر میں۔ ہر بات میں اس کی مرضی پوچھتا۔ کام میں اسے ذرا چھوٹ نہ دیتا۔

وجے نہال ہو گئی۔ سمجھی جیسے جل ککڑی جوہڑ میں آ گئی ہو۔

لاکھے کسان کو وجے کی ایک بات پر بڑی چڑ تھی۔ کہتا۔ ری تو گندی کیوں رہتی ہے نہاتی دھوتی کیوں نہیں۔ منہ پر جردی چھائے رہتی ہے۔ الیاں بلیاں لگی رہتی ہیں۔ بال چکٹ، آنکھوں میں کیچ۔ وجے یہ سن کر گردن لٹکا لیتی۔

ایک دن جب وہ دونوں ندی کے کنارے کھڑے تھے تو لاکھا نے تاؤ کھا کر بالٹی اُٹھائی اور وجے پر اُنڈیل دی۔ پھر بالٹی پر بالٹی گرانے لگا۔ وجے بھاگی تو اس نے اسے پکڑ کر ندی میں چھلانگ لگا دی اور اسے یوں دھونے اور مانجھنے لگا جیسے وہ رسوئی کی گڈوی ہو۔

پھر جب وہ اسے کھینچ کر پانی سے باہر لایا تو اسے دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ سنہرے لانبے

بال۔ موری گردن، کٹورہ سی آنکھیں، دھاری ناک، پھول سے ہونٹ، چھوئی موئی سا بدن تو کون ہے ری۔ وہ گھگھیا کر بولا۔ تو استری نہیں تُو تو پری ہے ری پری۔

بالکا کچھ دیر کے لیے چُپ ہو گیا۔ بھی چپ ہو گئے تھے کسی کو بات کرنے کی سُدھ نہ رہی تھی۔

بالکا دیر تک چپ رہا۔ پھر بولا۔ بس اس دن سے لاکھے کے من میں جھجک بیٹھ گئی اور وہ وجے سے دُور ہٹتا گیا۔ وجے نے بار بار اسے سمجھایا۔ دیکھ لاکھے میں پری نہیں استری ہوں، استری۔

پر اس کی جھجک نہ گئی۔ بولا تو پری نہیں تو استری بھی نہیں۔ تو مور ہے میں کاگ ہوں۔ تیرا میرا کیا سمبندھ۔ کارن یہ کہ تو کامیوں میں سے ناہیں۔

کچھ دناں وجے اس کا منہ دیکھتی رہی۔ پھر زاش ہو گئی۔ پھر ایک دن وہ شوشی سے بولی چل شوشی یہاں ہمارا دانہ پانی کھتم ہو گیا۔

شوشی نے سر جھکا لیا۔ اور جوں کی توں بیٹھی رہی۔ جیسے بات سُنی ہی نہ ہو۔ کچھ دیر وہ اسے دیکھتی رہی۔ پھر بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ شوشی اب لاکھے کی ہو چکی تھی۔

وجے کا دل دھک سے رہ گیا اور وہ چُپ چاپ اکیلی باہر نکل گئی۔

بالکا چپ ہو گیا، بھی چپ ہو گئے تھے۔

کسی کو، پھر کیا ہوا پوچھنے کا دھیان نہ رہا تھا۔

پھر بالکے نے کہا:

پھر پتہ نہیں ---، کہتے ہیں وہ آج تک برابری کی ڈھونڈ میں بھٹکتی پھرتی ہے۔

آج بھی آدھی رات کے سمے راج گڑھی سے آواجیں آتی ہیں --- پربھو باہر کی سُندرتا کو بھیتر میں رچا دے کہ استری، استری بن جائے --- پرش کی کامنا کے ہاتھ کا کھلونا نہ رہے۔

بالکا چپ ہو گیا۔ ٹیلے پر گہری خاموشی چھا گئی۔

پھر کوئی دُور سے بولا۔ وجے رانی نے سچ کو پا لیا۔ جو اپنی سُندرتا کو اُچھالتی ہیں۔ بناؤ

سنگھار کا راکشس کھڑا کر لیتی ہیں انہیں برابری مانگنے کا کوئی ادھیکار نہیں۔

انہوں نے مڑ کر دیکھا سوامی جی دوار کے باہر کھڑے تھے۔

☆

بُش اور بُشرہ

آج میں آپ کو ایک لَو سٹوری سُناتا ہوں اس کہانی میں تین کردار پیش ہیں۔ محبت کی تکون ایک لڑکا، ایک لڑکی اور ایک ۲۵۰ طاقت کا موٹر سائیکل۔

آپ کہیں گے کہ لڑکا لڑکی تو خیر ہوئے موٹر سائیکل کو بیچ میں کیوں لے آئے۔ جناب والا! میں مجبور ہوں۔ موٹر سائیکل کو میں نہیں لایا۔ وہ خود بخود آ گیا ہے۔ آج کل جدید گھرانوں میں موٹر سائیکل بہت ایکٹو ہے۔ جہاں محبت کی بات سُنی شڑاپ سے بیچ میں آ گھستا ہے۔ موٹر سائیکل عصری تقاضا ہے جس طرح پُرانے زمانے میں وفا ہوتی تھی، جہاں محبت کی بھنک ہوتی، یوں دھرنا مار کر بیٹھ جاتی۔ جس طرح قرض خواہ کے دروازے پر مہاجن آ بیٹھا ہو۔ تو جناب اس کہانی میں محبت کو چلانے کی ساری ذمہ داری موٹر سائیکل پر ہے بلکہ یوں کہیے کہ اگر موٹر سائیکل نہ ہوتا تو لڑکا لڑکی جتنا زور چاہے لگا لیتے محبت پیدا ہی نہ ہوتی۔

آج کل محبت میں رفتار کو بڑی اہمیت حاصل ہے پُرانے زمانے میں بہلی میں بیٹھ کر ڈھینچوں ڈھینچوں چلتی تھی۔ آج کل موٹر میں زناٹے سے۔۔۔ نکل جاتی ہے۔۔۔ فٹاک سے منزل کو جا لیتی ہے۔۔۔ بس ایک ہی مشکل ہے کہ منزل پر پہنچ کر بھی نہیں رُکتی۔

ہاں تو صاحبو کہانی یوں ہے کہ:

ایک تھی لڑکی بش اور ایک تھا لڑکا ذولف، بش کو ذولف سے محبت تھی۔

معافی چاہتا ہوں محبت ایک پرانا لفظ ہے یہاں بیٹھتا نہیں۔ لیکن کیا کیا جائے کہ کوئی اور لفظ میسر نہیں مطلب ہے کہ بش کو ذولف سے والہانہ لگاؤ تھا انفچویشن تھی۔ بلکہ یوں کہیے

کہ ان فیچویشن اپنی شدت کی وجہ سے مجبوری بن چکی تھی یہ مجبوری بش کے گلے میں خوامخواہ پڑ گئی تھی، ساری شرارت موٹر سائیکل کی تھی۔

ہوا یوں کہ ایک دن جب وہ گھر کی ٹیریس پر کھڑی تھی تو دفعتاً ایک شور اُٹھا بھونچال سا آ گیا الماریوں میں رکھے ہوئے برتن بجنے لگے۔۔۔ میزوں پر گلدان جھومے۔ ٹی وی کا اریل تھرَایا اسلام آباد کی سڑک نما گلی گڑگڑاہٹ سے بھر گئی اور آخر کوئی چیز زوں۔۔۔ سے گلی سے یوں گزر گئی جیسے ہوائی چل گئی ہو۔

یہ ہوائی ذولف کا موٹر سائیکل تھا۔

بش دیکھتی۔۔۔ کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

دل اُچھل کر باہر نکل آیا۔ جسم گویا سکتے میں رہ گیا۔

ہائے اتنی تیزی۔۔۔ اتنی تڑپ جیسے بجلی گری ہو۔ پھر اسے پتہ چلا کہ یہ بجلی ہر روز شام کے پانچ بجے گلی پر گرتی ہے اس لیے وہ روز پانچ بجے اس کا انتظار کرنے لگی۔

جب ذولف گلی میں زوں سے نکل جاتا تو بش کو دِکھتا دِکھاتا کچھ نہ تھا۔ صرف موٹر سائیکل کی ایک سرخ سی لکیر اور ہیلمٹ کا ایک سلیٹی دھبہ۔

تو جناب بش کو اس سُرخ اور سلیٹی دھبے سے محبت ہو گئی۔ جب بھی سرخ لکیر اور سلیٹی دھبہ زناٹے سے گزرتے۔ اس کا دل اُچھل کر باہر آ جاتا اور جسم میں سوئیاں چبھنے لگتیں۔

دراصل بش کو رفتار سے عشق تھا۔ پتہ نہیں کیوں شائد عصری تقاضا ہو یا شاید ذہن میں کوئی غدود زائد لگ گیا ہو۔ جیسے پائلٹوں میں یا موٹر ریسیوں میں ہوتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے بش میں ایک بے نام اضطراب بھی تھا۔ جو اس کے بند بند کو جھُلاتا رہتا تھا۔

اوّل تو وہ ایک جگہ بیٹھ نہیں سکتی تھی۔ ابھی یہاں بیٹھی تھی۔ اب وہاں کھڑی گنگنا رہی ہے لو وہ تو ٹیرس پر ٹہلنے لگی۔ یہاں سے وہاں جا بیٹھنے کے لیے اسے اڑانے کی چنداں ضرورت نہ پڑتی تھی۔ بیٹھتی تو جسم کا رُواں رُواں دُھنکی کی طرح بجتا۔ اور کچھ نہیں تو پاؤں چلتا۔ چلے جاتا اتنی تیزی سے جیسے انڈہ پھینٹتے ہوئے چمچہ چلتا ہے مختصر یہ کہ بش بڑی ہی بے تاب روح تھی۔

جو کام ذہن میں آتا، چاہتی کہ ابھی ہو جائے۔ ابھی اسی وقت جھٹ پٹ، خیال ذہن میں اس قدر تیزی سے آتے کہ ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو جاتے جیسے تصویر ملٹی ایکسپوژرز کی وجہ سے دھندلی ہو جائے۔

مثلاً نام ہی کو لیجیے۔

اس کا نام بشرہ تھا۔۔۔ جو اسے پسند نہ تھا۔

توبہ اتنا لمبا نام۔۔۔ بش۔۔۔ را۔۔۔ اُوں ہُوں، نام ایسا ہو جو چھوٹا ہو ترت ہو خستہ ہو کڑا کے دار ہو۔۔۔ اسی وجہ سے اس نے نام کو کاٹ کر بش رکھ لیا تھا۔ بش کے صوتی اثر میں تیزی تھی اور پھر جھٹکا بھی اور معنوی طور پر بھی وہ۔۔۔ لیکن چھوڑیئے بش کو معنوی پہلو سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

اس نے ذوالفقار کو بھی ذولف کہنا شروع کر دیا تھا اتنا لمبا نام ذوالفقار توبہ ڈریگ کرتا ہے۔

اگرچہ بش روز ذولف کا انتظار کرتی تھی تاکہ گزرتے ہوئے اسے دیکھے۔ لیکن اس نے ذولف کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کیسے دیکھتی۔ قیام کے عالم میں ہوتا تو دیکھتی اور اگر ذولف قیام کے عالم میں ہوتا تو وہ ایک عام سالڑکا بن کر رہ جاتا۔۔۔ سارا رومینس تو سپیڈ نے پیدا کر رکھا تھا۔

بش کو تو یہ بھی علم نہ تھا کہ ذولف کے خدوخال کیسے ہیں۔۔۔ لیکن ہٹایئے محبت میں آج کل خدوخال کون دیکھتا ہے۔

بش کو ذولف سے اس لیے محبت نہ تھی کہ وہ ذولف تھا بلکہ اس لیے کہ وہ جدیدیت کا سمبل تھا۔ اور جدیدیت سے اسے عشق تھا۔ اس کی نظر میں ہر چیز ہر بات جو دورِ جدید کی نشان دہی کرتی تھی۔ اس قابل تھی کہ خود کو اس پر نثار کر دیا جائے اور ذولف میں جدیدیت کی ایک نہیں تین تین باتیں تھیں۔ ایک تو وہ رفتار کا دیوانہ تھا۔۔۔ حرکت اس کے لیے زندگی تھی اور قیام موت، پھر وہ اضطراب کا بادشاہ تھا۔ اضطراب بھی تو حرکت ہی ہوتی ہے۔ گرداب زدہ حرکت۔ بس ذرا رنگ مختلف ہوتا ہے تیسری خصوصیت یہ تھی کہ وہ نتائج سے بے پروا

تھا۔ بے نیاز تھا۔ یوں کیا تو یہ ہو جائے گا کہیں وہ نہ ہو جائے۔ پڑا ہو۔ جو ہو سو ہو۔ ٹوہل دد اِٹ۔

ذولف ایک کھاتے پیتے بنے سجے گھر کا فرزند تھا۔ باپ ایک اعلیٰ افسر تھا۔ ماں سوشل سرکلز کی جان تھی۔ گھر کی فضا لوٹ لو کے جذبے سے اس حد تک بھری ہوئی تھی کہ کسی کو کسی کی خبر نہ تھی۔ وہ گھر نہیں بلکہ بے تعلقی کی جنت تھا۔

پھر بھی کبھی کبھار ماں باپ کی بچوں سے ملاقات ہو ہی جاتی۔ اور انہیں احساس ہوتا کہ وہ ان کے اپنے بچے ہیں۔ سوشل ماں کے لیے یہ احساس بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ خصوصاً جب بچے جوان ہو جائیں تو۔ وہ ماں کی عمر کی گواہی جو دینے لگتے ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ سوشل ماں کے لیے عمر کا مسئلہ بڑا نازک ہوتا ہے، بہرصورت ذولف کی ماں اس بات پر بہت خوش تھی کہ بیٹے نے موٹر سائیکل رائیڈنگ کی ہابی کو اپنا رکھا ہے اور شام میں گھر میں نہیں بلکہ سڑک پر گزارتا ہے باپ بھی خوش تھا کہ بیٹے میں ڈیلش ہے اور جب وہ کیریر کے سائیکل پر چڑھے گا تو کچھ کر دکھائے گا۔

دراصل ماں باپ دونوں ہی آزاد خیال تھے اور اپنے لبریٹڈ ہونے پر فخر محسوس کیا کرتے تھے ان کے دلوں میں صرف دو بندھن باقی رہ گئے تھے۔ سٹیٹس اور کیریر۔ شاید یہ بندھن لبریٹڈ ہونے کے لیے از بس ضروری ہوتے ہیں۔

ذولف کو بچپن ہی سے رفتار سے عشق تھا اور یہ عشق اتنا شدید تھا کہ مزید کسی عشق کی گنجائش نہ رہی تھی۔

وہ صبح انسٹیٹیوٹ میں حاضری دیتا جہاں وہ مینجمنٹ کورس کے آخری دور میں تھا۔ پھر شام کو پانچ بجے موٹر سائیکل رائیڈنگ پر نکل جاتا۔ ایکسلیٹر دباتا اور دباتا۔ حتیٰ کہ موٹر سائیکل ہوا میں تیرنے لگتا۔ بس یہی اس کی جنت تھی۔

سات آٹھ روز تو بش ٹیرس پر کھڑی ہو کر ذولف کی زوں سنتی رہی، دیکھتی رہی۔ سُن سُن کر نہال ہوتی رہی۔ پھر وہ مضطرب ہو گئی۔ یوں جیسے شیر پنجرے میں اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر ٹہل لگاتا ہے۔ مقصد نہ اِدھر آنا ہوتا ہے نہ اُدھر جانا ذولف کی زوں۔۔۔ بش

کے دل میں اک زوں چلا دیتی وہ زوں اس کے بند بند میں گونجتی۔

بش کے دل میں وصال کے لیے تڑپ پیدا نہ ہوتی تھی جس طرح پرانے زمانے کے عشق میں پیدا ہوا کرتی تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ بش کے ذہن میں وصال کا تخیل سرے سے وجود ہی نہ رکھتا تھا کہ وہ کیا ہوتا ہے۔ کوئی کیفیت ہے یا منزل۔۔۔ اس کے دل میں یہ آرزو بھی نہیں تھی کہ ذولف آنکھوں کے سامنے رہے اور میں اسے دیکھتی رہوں۔ نگاہوں کے سامنے رہنے یا اسے دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا چونکہ سامنے رہنا تو قیام کی صورت ہے اور قیام تو اس کے نزدیک بوریت تھا۔ رہا دیکھنے کا سوال تو اگر آپ کے سر پر ہیلمٹ سوار ہو منہ پر پلاسٹک کا چھجہ چڑھا ہو جسم پر چمڑے کا جیکٹ ہو ہاتھوں پر دستانے ہوں تو دیکھنا کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔

ذولف کی زوں دیکھ کر بش کے دل میں صرف ایک آرزو پیدا ہوتی تھی کہ اس لال لکیر اور سلیٹی دھبے کے ساتھ اس کے اپنے بال بھی ہوا میں لہرائیں وہ بھی اس متحرک تصویر کا ایک حصہ بن جائے اگر وہ پُرانے دور کی یا پابند گھرانے کی لڑکی ہوتی تو بیٹھ کر آہیں بھرتی یا دل بہلانے کے لیے فلمی گانے سُنتی لیکن بش تو جدید گھرانے کی پیداوار تھی۔ گھر والے لڑکی پر نظر رکھنے کے قابل نہ تھے اڑوس پڑوس والے ذاتی معاملے کو کچھ زیادہ ہی ذاتی سمجھتے تھے اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔

ان حالات میں بات چھپانے کی کیا ضرورت تھی اس لیے بش نے شام کے پانچ بجے کی اس لذت میں چھوٹی بہن کو بھی شریک کر لیا۔ چھوٹی بہن سے بات ممی تک پہنچی۔ ممی نے بھلا کیا کہنا تھا مسکرا کر چپ ہو رہی۔

لہٰذا ایک شام بش ٹیرس کی بجائے گلی میں جا کھڑی ہوئی۔ ذولف آیا تو اس نے انگڑائی کی صورت دونوں ہاتھ اُٹھا دیئے۔ رُکنے کا اشارہ کیا۔

ذولف نے موٹر سائیکل روک لیا۔

اے لفٹ پلیز وہ بولی۔

اوکے جمپ آن۔

وہ اُچھل کر بیک سیٹ پر جا بیٹھی۔ موٹر سائیکل چل پڑا۔ اگر وہ روایتی ماحول میں پلے ہوتے اور وہ کسی نوجوان کے موٹر سائیکل کی بیک سیٹ پر بیٹھ جاتی تو مشکل پڑ جاتی۔ نوجوان کے لیے سورج سوا نیزے پر آ ٹکتا۔ پھر پسینہ ہی پسینہ کنفیوژن ہی کنفیوژن، ذہن میں بریک اور ایکسیلیٹر گڈمڈ ہو جاتے۔ لیکن ذولف کو کچھ بھی نہ ہوا۔ جیسے پیچھے بھُس کی بوری دھری ہو۔

البتہ اس نے سپیڈ سلو کر دی کہ بوری گر نہ جائے۔

سلو کیوں ہو گئے، وہ چلائی۔

سڑک بمپی ہے وہ بولا۔

پڑی ہو۔

گر جائے گی۔

سو واٹ۔

ذولف کو بات سمجھ میں آ گئی کہ اُسے کہیں جانا نہیں پہنچنا نہیں۔۔۔ صرف جوئے رائیڈ ہے۔ ذولف نے ایکسیلیٹر کھول دیا۔ موٹر سائیکل ہوا میں تیرنے لگا۔

پھر یہ روز کا معمول بن گیا۔ ذولف آ کر رُک جاتا ٹوٹ بجاتا بش دوڑ کر آتی اُچھل کر بیک سیٹ پر چڑھ جاتی۔ ذولف ایکسیلیٹر کھولتا کھولے جاتا اور موٹر سائیکل ہوا میں اڑے جاتا۔

ٹریفک پولیس ذولف سے واقف تھی۔ جب ذولف گزرتا تو چوک کا سپاہی منہ موڑ کر کھڑا ہو جاتا۔ ہم نہیں دیکھ رہے کی صورت۔

ابتدائی ایام میں جب وہ ذولف کے آشنا نہ تھے تو سپاہی لپک کر آگے بڑھا تھا۔ سیٹی بجا کر اسے روکا تھا پھر تحکمانہ شان سے جیب سے کاپی پنسل نکالے تھے اور حسبِ دستور فرعونی لہجے میں پوچھا تھا کیا نام ہے تیرا۔ باپ کا نام۔ کیا کرتے ہیں وہ جواب سُن کر سپاہی کا کلف اُتر گیا تھا۔ گردن جھک گئی تھی۔ اور کاپی پنسل دوبارہ جیب میں جا چھپی تھی اس روز کے بعد وہ ذولف کو پہچاننے لگے تھے۔ یوں کہ جب بھی وہ گزرتا سپاہی منہ موڑ کر کھڑا ہو جاتا۔ ہم نہیں دیکھ رہے کی صورت۔

چار ایک دن تو بش بیک سیٹ پر سٹریپ سے چمٹی رہی پھر جو ایک روز دار بمپ لگا تو اس نے چیخ مار کر اپنی بانہیں ذولف کے گرد حمائل کر دیں۔۔۔ ذولف کو پھر بھی کچھ نہ ہوا البتہ بش کو ہوا۔۔۔ کچھ کچھ۔۔۔ اور اس کی بانہیں ذولف کا سہارا لینے کی عادی ہو گئیں۔

پھر وہ بانہیں گھسیٹ کر اُسے اپنے گھر میں لے گئیں۔ ممی ڈیڈی سے تعارف ہوا۔ یوں دونوں کنبے ایک دوسرے سے ملنے لگے۔

جدید گھرانوں میں یہ عیب ہے کہ وہاں لَو سٹوری جنم لینے میں تو بڑی بے تاب ہوتی ہے مگر پھلتی پھولتی نہیں یا شاید محبت میں یہ عیب ہے کہ پابندیاں نہ ہوں تو وہ چلتی نہیں۔ ختم ہو جاتی ہے صرف سٹوری باقی رہ جاتی ہے اور یا وہ افیئر بن کر اپنی عظمت کھو دیتی ہے محبت میں انسان کے لیے محرومی لازم ہے محرومی شامل ہو جائے تو محبت عشق بن جاتی ہے۔ عشق انسان کو مادی دُنیا کی گرفت سے نکال کر نہ جانے کہاں لے اُڑتا ہے۔

بش اور ذولف کی دُنیا میں پابندیاں نہیں تھیں رکاوٹوں کا وجود نہ تھا دونوں گھرانوں کے ہاں سٹیٹس بھی تھا اور کیریر کے مواقعے بھی۔ لہٰذا بش نے ممی کے ذریعے بات چلائی ذولف کے گھر والوں نے پیغام بھجوا دیا جو منظور کر لیا گیا اور وہ ایک دوسرے سے منسوب ہو گئے۔

منگنی سے ان کی زندگی میں کوئی فرق نہ پڑا۔ نہ خوشی کا احساس تھا نہ پا لینے کا۔ پا لینے کی خوشی تو جبھی ہوتی ہے جب پا لینے میں دشواریاں حائل ہوں، یہ عشق بھی عجیب عشق تھا۔ ذولف حرکت کا دیوانہ تھا اور بش متحرک کی مداح تھی۔ وہ تماشہ تھا یہ تماشائی تھی۔ تماشے کو تماشائی سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔

اگر ان تینوں کرداروں تک محدود رہتی تو یہ کہانی شادی پر شہنائی کے ساتھ ختم ہو جاتی۔ اور اس کے بعد دونوں روٹین زندگی بسر کرنے لگتے۔ اور کہانی سننے والے ناک چڑھا کر کہتے یہ کہانی تو بالکل سطحی ہے۔ کھوکھلی بے لذت، بے جان۔ اس میں تو زندگی کا زیر و بم ہی نہیں۔ صرف زیر ہی زیر، بم کا نشان نہیں ملتا۔

وہ تو محض اتفاق کی بات تھی کہ چوتھے کردار نے غیر متوقع طور پر سر آ نکالا اور اسے

کہانی بنادیا۔۔۔!

ہوا یوں کہ ایک شام جب وہ گول چوک کے قریب پہنچے تو وہ رُک گیا۔ بش اُتر گئی ذولف نے موٹر سائیکل کو سٹینڈ پر کھڑا کر دیا۔ اور پھر گول چوک سے ملحقہ پارک کی طرف چل پڑا بش حیران تھی کہ بات کیا ہے۔

دفعتاً ذولف بولا ''بش وی آر ڈوئنگ اِٹ۔''

''ڈوئنگ واٹ'' وہ چلائی۔

کراچی گلگت نان سٹاپ ریس اس نے جواب دیا۔

جب بش کو بات سمجھ میں آئی تو خوشی سے اس کے بدن پر چیونٹے دوڑنے لگے۔

کیا میں بھی ساتھ ہوں گی۔ بش نے پوچھا۔

سیکنڈ مین کے بغیر یہ ریس ہو ہی نہیں سکتی۔

بش کی باچھیں کھِل گئیں۔

تمہیں پریکٹس کرنی پڑے گی۔

پریکٹس۔۔۔ کیسی پریکٹس۔

سیکنڈ مین بننے کی پریکٹس۔۔ موٹر سائیکل کی پوری مکینکی سیکھنی پڑے گی۔ پہیہ بدلنا پنکچر لگانا، چلتے چلتے تیل بھرنا۔ الیکٹرک وائرنگ کو سمجھنا، پلگ صاف کرنا، بدلنا، سیکنڈ مین کا کام بہت رف ہوتا ہے۔

بش تن کر کھڑی ہو گئی بولی ''آئی وِل۔''

''شُئر'' اس نے پوچھا۔

''شُئر ایز دی سن شائنز۔''

''اٹ از اے چیلنج۔''

''آئی ٹیک اٹ'' وہ دانت بھینچ کر بولی۔

یہ سلک سٹف نہیں چلے گا۔ ذولف نے اس کے کپڑوں کی طرف اشارہ کیا ''اے ورک مین کِٹ۔ سپکس ہیلمٹ گلوز۔''

کبھی کچھ۔

او کے۔

ٹھیک وہ اُٹھ کھڑا ہوا کل سے ٹریننگ شروع۔

ابھی وہ موٹر سائیکل کے قریب پہنچے تھے کہ گول چوک سے ایک شور سنائی دیا۔

ایک ٹرک راہگیر کو کچل کر بھاگا آ رہا تھا چوک کا سپاہی روکنے کے لیے سیٹیاں مار رہا تھا آس پاس کے لوگ چلا رہے تھے۔

روکو، روکو، پکڑو۔

یہ منظر دیکھ کر ذولف پر وحشت سوار ہوگئی۔ ایک ہی جست میں وہ موٹر سائیکل پر سوار ہوگیا اور ٹرک کے پیچھے ہوا ہو گیا۔

کچھ دیر دونوں کے درمیان ریس ہوتی رہی لیکن ذولف بجلی کی طرح آگے نکل گیا اور ٹرک کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ پھر ایک دھماکہ ہوا اور ٹرک درخت سے ٹکرا کر لڑھکتا ہوا نچان میں جا گرا۔ بش نے آنکھیں بند کرلیں۔ اس کا دل ڈوب گیا۔

ذولف کو اٹھا کر ہسپتال لے گئے۔ دو دن اُمید و بیم کا آرا چلتا رہا۔ آخر اُمید غالب آئی۔ ذولف بچ گیا لیکن اس کی دونوں ٹانگیں کاٹ دی گئیں۔

اس پر چند ایک روز تو بش یوں ادھ موئی پڑی رہی جیسے اس کی دُنیا ہی لٹ گئی ہو۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے اندر کا سوواٹ بیدار ہوا۔۔۔!

سہیلیوں نے اسے سمجھایا۔

ایک بولی زدں۔۔۔ سے لگن لگاؤ گی تو زناٹا تو ہوگا۔

دوسری بولی، مری کیوں جاتی ہے۔ زدں تو ختم نہیں ہوا۔۔۔ سڑک پر بڑا بڑا زدں۔۔۔ پڑا ہے ابھی۔

تیسری نے کہا۔۔۔ منگیتر کا غم کھاتی ہے کیا۔ منگنی کو بھول جا۔ تیرے گھر والے اب کوئی اور منگیتر ڈھونڈیں گے۔

چوتھی بولی۔۔۔ لفٹ کا کیا ہے جس سے مرضی ہے مانگ لے، جس سے مانگے گی وہ

پھولے نہیں سمائے گا۔

ان باتوں کے باوجود وہ روز ہسپتال جاتی رہی دو مہینے گزر گئے۔اس کی اس باقاعدگی کو دیکھ کر ممی ڈیڈی گھبرا گئے ایک روز ہسپتال جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی تو ممی نے اسے آواز دی۔۔۔بش ذرا ادھر آنا۔

جب ممی کے کمرے میں گئی تو دیکھا کہ ڈیڈی بھی وہیں بیٹھے پائپ پی رہے ہیں۔بش ممی نے کہا۔۔۔تُو کیوں خود کو ہلکان کر رہی ہے؟

میں نہیں سمجھی ممی۔وہ بولی۔

بھئی ہسپتال کی فضا بڑی ڈیپریسنگ ہوتی ہے۔ذہن پر بُرا اثر کرتی ہے۔ڈیڈی نے کہا۔

اگر جانا ضروری ہے تو ہفتے میں ایک دو دفعہ ہو آیا کر۔ممی بولی۔

بش۔۔۔ڈیڈی نے کہا۔اب اس انگیج منٹ کو ختم کر دینا چاہیے۔تو ایک سمجھ دار لڑکی ہے ایک معذور کے ساتھ زندگی بسر نہیں ہو سکتی۔

وہ تو اب،سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ممی بولی۔

ہاں فارگٹ اٹ۔۔۔ڈیڈی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

تو کیا کہتی ہے بش۔

ٹھیک ہے وہ بولی۔ساری عمر میں وہیل چیئر سے تو بندھی نہیں رہ سکتی۔بش کا حلق بند ہو گیا۔آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

سمجھ دار لڑکی ہے۔ڈیڈی نے بش کو تھپکتے ہوئے کہا۔

ڈیڈی آج تو مجھے جانا ہی ہوگا۔البتہ کل۔بش رُک گئی۔

ضرور ضرور۔ڈیڈی نے جواب دیا۔

بلکہ اچھا ہے۔ممی بولی،آج خدا حافظ کر آؤ۔

اس شام جب وہ ذولف کے پاس پہنچی تو وہ بڑی حسرت سے پورٹیکو میں کھڑے موٹر سائیکل کی طرف دیکھ رہا تھا۔برآمدے کے سامنے پلاٹ میں وہ وہیل چیئر پر بیٹھا تھا۔

ہیلو، وہ بولی۔

ذولف چونکا اس نے نگاہ اٹھائی۔۔۔اوہ بش۔

آج اکیلے بیٹھے ہو۔

ہوں۔

گھر والے نہیں آئے۔

کوئی انگیج منٹ ہوگی۔۔۔صرف تم ہی روزانہ آتی ہو۔

اچھا اس نے حیرت سے کہا۔

کل سے شاید تم بھی نہ آؤ۔۔۔وہ بولا۔

کیوں۔

کل میں گھر جارہا ہوں۔

کیا واقعی۔

ہاں بیساکھیاں آگئی ہیں۔

کہاں ہیں۔

اندر پڑی ہیں۔

ہوں۔۔۔وہ چپ ہوگئی۔ دیر تک وہ دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔

ذولف بش بولی۔ آرٹیفیشل لمبز نہیں لگتے کیا۔

لگتے ہیں۔ اس نے جواب دیا۔ صرف دِکھنے دکھانے کے لیے لگتے ہیں۔ ویسے نہیں۔

اوہ۔۔۔وہ آہ بھر کر خاموش ہوگئی۔

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ پھر بولی۔ ٹانگیں تو ٹھیک ہوگئی نا۔

ہاں ٹانگیں تو ٹھیک ہیں لیکن۔۔۔

لیکن کیا۔۔۔اس نے پوچھا۔

دی لگز آر آل رائٹ۔ وہ بولا۔ بٹ ایوری تھنگ اباؤٹ دیم شل نیور بی آل رائٹ

وہ پھر خاموش ہوگئی۔ دل پر بوجھ پڑ گیا۔ اس نے خود کو جھنجھوڑا۔ مجھے اب جانا چاہیے۔

ہاں وہ بولا۔۔۔ تمہیں جانا ہی پڑے گا۔ کب تک اپاہج کے ساتھ بندھی رہو گی۔

بش کو ایک چکر سا آیا۔ لیکن اس نے خود کو سنبھال لیا۔ خدا حافظ وہ بولی۔

راستے میں وہ سوچتی رہی۔ سچ کہتا تھا اپاہج سے کون بندھا رہے۔ ڈیڈی بھی ٹھیک کہتے ہیں اس دلدل سے بچ نکلنا لازم ہے۔

میری سہیلیاں نوم، بیدہ، پوپو سب میرا مذاق اڑاتی ہیں۔

چلو اچھا ہوا۔۔۔ آج خدا حافظ کہہ دیا۔

جب وہ گھر پہنچی تو بہت خوش تھی۔

گھر والوں نے اسے دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا۔

اس رات بش بڑے اطمینان کی نیند سوئی لیکن پتہ نہیں آدھی رات کو کیا ہوا گویا کسی نے اسے جگا دیا۔ وہ اٹھ بیٹھی۔ کمرہ کسی موجودگی سے بھرا ہوا تھا۔ اور وہ موجودگی گویا بہت ہی مانوس موجودگی تھی۔

اس کے ذہن میں ایک احساس اُبھرا۔۔۔ یوں جیسے ہفتوں بھولی ہوئی بات یکلخت ذہن میں اُبھر آئی ہے۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہ ذولف کے پیچھے ہوا میں تیر رہی ہو۔ موٹر سائیکل گھاؤں گھاؤں کر رہا تھا۔ پھر وہ گھاؤں گھاؤں مدھم پڑتی گئی۔ حتیٰ کہ خاموشی چھا گئی۔ وہ دونوں ہوا میں تیرتے ہوئے جا رہے تھے۔ موٹر سائیکل کا نشان باقی نہ رہا تھا۔

پتہ نہیں کیا ہوا۔ ذولف کی ذات اُبھری اُبھرتی چلی گئی۔۔۔ سارا کمرہ ذولف کے پسینے کی خوشبو سے بھر گیا۔

بش گھبرا گئی۔ اس موجودگی کے احساس سے گھبرا گئی۔ وہ موجودگی اس کے اندر سے یوں نکل رہی تھی جیسے اُس میں ایک عظیم تبدیلی رونما ہو رہی ہو۔ جیسے سُنڈی تتلی بنی جا رہی ہو۔ جیسے لڑکی عورت میں بدل رہی ہو۔

بش پھیل رہی تھی۔ بھاری درخت بنتی جا رہی تھی۔ اس کے دل میں وسعتیں اُبھر رہی تھیں۔ اتھاہ گہرائیاں انگڑائیاں لے رہی تھیں جسم حیات سے لت پت ہوا جا رہا تھا۔۔۔ حسیات میں رشتوں کے بندھن اُبھر رہے تھے۔ اس کی بانہیں ذولف کے گرد یوں پیوست

ہو گئی تھیں جیسے بیل بوٹے کے اردگرد بل کھا کر لپٹ جاتی ہے ذولف کا ہیلمٹ سر سے گر گیا تھا۔ جیکٹ تار تار ہو گیا تھا۔ آنکھوں پر چڑھے ہوئے پلاسٹک کے چھجے ریزہ ریزہ ہو گئے تھے۔ اس کی ذات ننگی ہو گئی تھی اور ذات کی خوشبو سے سارا کمرہ مہک اٹھا تھا۔

اگلے روز وہ بے دھڑک ڈیڈی کے کمرے میں داخل ہوئی بولی ڈیڈی میں نے فیصلہ کر لیا ہے میں ذولف سے اپنی انگیج منٹ نہیں توڑوں گی۔

باپ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

میں ذولف سے شادی کروں گی۔ وہ بولی۔

لیکن بیٹی باپ کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''ہی نیڈز می ڈیڈی''۔ وہ بولی۔

''بٹ ڈو یو نیڈ ہم'' باپ نے پوچھا۔

اس نے جواب دیا ''آئی ڈو آئی ایم ہز تھرو اینڈ تھرو اِٹ اِز اے لینڈ آف نو ریٹرن۔''

ڈیڈی نے چونک کر بش کی طرف دیکھا۔ اس کے سامنے بش نہیں بشرہ کھڑی تھی۔

☆

وہ

یہ کون آ گھسا ہے میرے گھر میں۔ بن بلائے بن پوچھے۔ بن بتائے۔ کیوں۔
یہ کیسی موجودگی ہے۔ میرا سارا گھر اس سے بھرا ہوا ہے۔ وہ ہر کمرے میں بیٹھا ہے۔ سیڑھیوں میں صحن میں برآمدوں میں باورچی خانے میں۔ ہر جگہ۔ ہر وقت دن ہو یا رات صبح ہو یا شام۔ میرا گھر مجھ سے اس قدر بھرا ہوا نہیں جس قدر اُس سے بھرا ہوا ہے۔
کیا مصیبت ہے۔ زندگی میں پہلی بار میں دوکیلا ہوا ہوں۔۔۔ میں جو ازلی طور پر اکیلا تھا۔
بچپن میں بھرے گھر مَیں اکیلا تھا۔ چلا جاتا تو کسی کو پتہ نہ چلتا کہ چلا گیا ہُوں۔ آ جاتا تو کوئی محسوس نہ کرتا کہ آ گیا ہُوں۔
جوانی میں اپنا اکیلا پن دُور کرنے کے لیے میں نے ایک عورت سے محبت لگا لی۔ اپنا سبھی کچھ دے کر خود اس کی دہلیز پر بیٹھ گیا۔ لُٹ پُٹ گیا تو پتہ چلا کہ اکیلا پن اور بھی گہرا ہو گیا ہے جرأت ہوتی تو دہلیز سے اُٹھ جاتا۔ لیکن ایک بار بیٹھ کر اُٹھ جانا۔ میری سرشت میں نہ تھا۔ نہیں ہے۔۔۔ لہٰذا اُٹھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اس لیے بیٹھا رہا، بیٹھا رہا سولہ سال بیت گئے حتیٰ کہ لٹے پٹے اور اکیلے رہنے کی لت پڑ گئی۔ پھر وہ اپنا گھر چھوڑ کر میرے گھر میں آ گئی۔ میری ہو گئی اور میں اپنے گھر کی دہلیز پر آ بیٹھا۔ مجھے دیکھ کر وہ حیران رہ گئی بولی "اب مَیں تیری ہوں۔"
"ہاں" میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے جواب دیا۔ کتنی خوشی کی بات ہے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی دیکھتی رہی۔ میں خوشی کے نشے میں چور اسے دیکھتا رہا دیکھتا

رہا۔

''تُو مجھے دیکھ رہا ہے'' وہ بولی۔

''اور میرا کام ہی کیا ہے۔''

''میں یہاں ہوں یہاں تیرے پاس۔''

''ہاں تُو میرے سامنے ہے۔''

''لیکن تُو تو اب بھی دہلیز پر بیٹھا ہے۔''

''اور کہاں بیٹھوں؟''

''قریب آ جا۔''

''قریب آ گیا تو تُو مجھے نظر کیسے آئے گی؟''

''پتہ ہے تیری جگہ کونسی ہے؟'' اُس نے اپنی گود پھیلا دی۔

''وہی جہاں میں بیٹھا ہوں'' میں نے سر اُٹھائے بغیر کہا۔

حیرت سے اس کی آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں۔

پھر آہستہ آہستہ وہ بند ہوتی گئیں۔ بند ہوتی گئیں۔ ہمیشہ کے لیے بند ہو گئیں۔۔۔

اور میں پھر سے اکیلا رہ گیا۔

پھر لوگوں نے ''زبردستی'' پکڑ کر میری شادی کر دی۔ جب میں نے پہلی بار اپنی بیوی کو دیکھا تو مجھے پتہ چل گیا کہ وہ بھی مجھ ایسی ہے۔ لُٹی پُٹی اکیلی۔

اُس نے سات سال اپنے پہلے دولہا کی انتظار میں دہلیز پر بیٹھ کر گزار دیئے تھے۔

ہمارا آپس میں ان کہا سمجھوتہ ہو گیا۔ اور ہم دونوں دو کیلے میں اکیلے اکیلے رہنے لگے۔

ہاں میں تو ازلی طور پر اکیلا ہوں۔ اب یہ کون آ گیا ہے میرے گھر میں کیوں دھرنا مار کر بیٹھ گیا ہے۔ یہاں آخر۔۔۔ وجہ۔۔۔ مطلب۔

ویسے دیکھنے میں آج بھی میں اکیلا دِکھتا ہوں۔۔۔ کسی کو خبر نہیں کہ گھر میں کوئی آ گیا ہے۔ میری بیوی کو بھی پتہ نہیں۔ صرف میں جانتا ہوں کہ میں اکیلا نہیں رہا۔ وہ آ گیا ہے۔ ور میرا گھر اس سے یوں بھر گیا ہے جیسے ماں کا سارا وجود ہونے والے بچے سے بھر جاتا

ہے۔

صاحبو مجھے پتہ نہیں کہ وہ کون ہے صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ ہے۔ کیوں۔ کس لیے اُس نے میرے اکیلے پن کی مسند کو یوں تار تار کر دیا ہے۔ مجھے علم نہیں۔ صرف دُکھ ہے۔ اپنے اکیلے پن کو کھو دینے کا دُکھ۔

زندگی میں مَیں نے ایک ہی امتیاز حاصل کیا تھا۔

زندگی گزارنے کا ایک ہی طریقہ سیکھا تھا۔

اکیلے پن نے مجھے بڑا اعزاز بخشا تھا، مقام بخشا تھا۔

مجھے بُت بنا دیا تھا۔۔۔ بہت بڑا بُت۔

صاحبو۔ اکیلا پن، بہت بڑا بت گر ہے۔

زندگی بھر میں بُت بنا رہا۔

بُت کا مطالبہ ہے کہ کوئی پجاری ہو۔ نہ ملے تو وہ خود اپنا پُجاری بن جاتا ہے۔ زندگی بھر مَیں خود کی پُوجا کرتا رہا۔ اس لیے نہیں کہ جھکنا سیکھوں۔ بلکہ اس لیے کہ بُت کی شان قائم رہے لیکن جب سے وہ آیا ہے۔ بُت تڑخ رہا ہے ٹوٹ رہا ہے ریزہ ریزہ ہوا جا رہا ہے۔ میری ساری زندگی کی کمائی میری آنکھوں کے سامنے لُٹی جا رہی ہے۔

سمجھ میں نہیں آ رہا کہ بے نام موجودگی نے اتنے بڑے بُت کو کیسے توڑ دیا۔ اس کے ہاتھوں میں تیشہ نہیں کلہاڑا نہیں کدال نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں اس کے انداز میں تشدّد نہیں طیش نہیں غصہ نہیں پھر یہ کیسے ہوا۔

بُتوں کو توڑنے کے لیے تو غزنوی پیدا ہوتے ہیں۔ حملے کیے جاتے ہیں۔ ایک دو نہیں۔ سولہ سترہ۔ فوجیں چڑھائی کرتی ہیں۔ تہس نہس کرتی ہیں یوں تو کبھی نہیں ہوتا کہ ایک بے نام ان جانا وہ چپکے سے آئے دھرنا مار کر بیٹھ جائے اور اس کی موجودگی سے بُت خود بخود تڑخنے لگے۔

کبھی کبھی مجھے شک پڑتا ہے کہ یہ وہی تو نہیں جس کا نام لے لے کر چھٹپنے میں بڑے بڑے بوڑھے مجھے ڈرایا کرتے تھے۔ جس سے ڈر ڈر کر میں جوان ہوا تھا۔ پھر جوانی میں

دانشوروں سے ملا تو ہم مل کر اس کا مذاق اُڑایا کرتے تھے۔ دراصل بچپن میں اس سے ڈر ڈر کر اب ہم اس سے انتقام لے رہے تھے۔

پھر اُدھیڑ عمر میں مَیں اس سے بے نیاز ہو گیا تھا۔۔۔ہے تو پڑا ہو۔۔۔نہیں ہے تو نہ سہی کیا فرق پڑتا ہے لیکن نہیں یہ وہ نہیں ہوسکتا۔ وہ تو بہت ڈراؤنا تھا۔ اُس نے آگ کی ایک بہت بڑی بھٹی جلا رکھی تھی ہاتھ میں سونٹا تھا۔ سونٹا چلایا۔ لوگوں کو دھڑا دھڑ آگ میں ڈالتا جاتا۔ بس یہی اس کا کام تھا۔

پھر جوانی میں علم کے ساتھ ساتھ اس کی عظمت اُجاگر ہوئی۔ عظمت ہی عظمت، عظمت ہی عظمت۔ ڈر اور خوف کی جگہ حیرت نے جنم لیا۔ نہیں یہ وہ بھی نہیں۔ یہ موجودگی نہ تو ڈراؤنی ہے نہ حیرت کا جذبہ طاری کرتی ہے۔ یہ تو ایسے ہے جیسے لگن اور لگاؤ سے بھیگی ہوئی اِک فضا ہو۔ یوں لگتا ہے جیسے ماں کی کوکھ نے پھیل کر میرے گھر کو سمیٹ لیا ہو۔ ایک ''نِگ'' ہے جو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ ایک عجیب ساسکوں۔ لطافت کا ایک ٹھہراؤ۔

مجھ پر خوانخواہ ایک احساس محیط ہوا جارہا ہے۔ جیسے میں نے پالیا ہے۔ کیا پالیا ہے۔ اُوں ہُوں اس کا پتہ نہیں چلتا۔ بس پالیا ہے۔ جیسے سب کچھ پالیا ہے۔ میں نے کبھی اس کی آرزو نہیں کی تھی۔ اس کے لیے ڈھونڈ نہیں کی تھی۔ اسے پانے کی آرزو نہ تھی۔ کبھی اُسے چاہا نہ تھا کتنی عجیب بات ہے کہ ڈھونڈے بغیر پالو۔ جانے بغیر جان لو۔

پہلی مرتبہ جب میں نے اس کی موجودگی کو محسوس کیا تو میں ہکا بکا رہ گیا تھا۔ ان دنوں مَیں سخت فکرمند تھا۔ بے چین تھا۔ میرے افسر نے مجھ پر دو جھوٹے کیسز بنا رکھے تھے جو بڑی سنگین نوعیت کے تھے۔ وہ اس دھوم دھمکے سے بار بار ان کا ذکر کیا کرتا تھا کہ مجھے خود شک پڑنے لگا تھا کہ وہ مجھ پر الزام نہیں دھر رہا بلکہ سچ بول رہا ہے۔ میں خود کو مجرم سمجھنے لگا تھا۔ مجھ پر احساسِ جُرم چھائے جارہا تھا۔

اُس روز شام کا وقت تھا بڑی اُداس شام تھی وہ۔ لُٹی پُٹی۔ اس روز دفتر میں میری بہت تذلیل ہوئی تھی۔ انکوائری کمیشن نے میرے بیان کا مضحکہ اُڑایا تھا۔ وہ لوگ جو جانتے تھے کہ مجھ پر بہتان لگایا گیا ہے اُنہوں نے بھی میرے حق میں گواہی نہ دی تھی۔

دُکھ فکر اور اندیشوں کی بوجھل گٹھڑی کو کندھوں پر اُٹھائے میں گھر پہنچا۔ پہنچتے ہی دھڑام سے کھاٹ پر گر پڑا۔ وہاں پڑا رہا پڑا رہا۔ پتہ نہیں کتنی دیر تک پڑا رہا۔۔۔ پھر دفعتاً میں نے محسوس کیا جیسے سر پر کوئی بوجھ نہ ہو۔۔۔ ارے وہ گٹھڑی کیا ہوئی میں اُٹھ بیٹھا۔

میرے گرد ایک عجیب سی فضا مُعلق تھی۔ جیسے جیسے ایک لوری ہوا میں تیر رہی تھی۔ جیسے کمرے میں ایک ٹھنڈی کنڈیشنر لگا ہو۔ جیسے کمرے میں کوئی ہو۔ لگن اور لگاؤ سے بھیگی ہوئی موجودگی۔ یہ کون ہے۔ میرے گھر میں کون گھس آیا ہے میں نے سارے گھر کا چکّر لگایا کہ شاید کوئی ہو۔ کوئی بھی نہ تھا۔ پھر بھی کوئی ضرور تھا۔ اس بے نام موجودگی کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔

باورچی خانے میں میری بیوی گھٹنوں میں سر دیئے پیاز چیر رہی تھی۔ میں نے اسے دیکھا دیکھتا رہا وہ اکیلی بیٹھی تھی۔۔۔ اکیلی۔۔۔ لق و دق تنہا۔۔۔ اسے دیکھ کر مجھے پتہ چل گیا کہ کوئی نہیں ہے۔ کوئی بھی نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ گھر کی موجودگی ایک کو متاثر کرے دوسرے کو خبر ہی نہ ہو۔

سونے سے پہلے میں پڑھنے کا عادی ہوں۔ اس لیے نہیں کہ مجھے پڑھنے سے دلچسپی ہے۔ ایک تو اس لیے کہ کتاب سامنے ہو تو نیند آنے کے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔ دوسرے اس لیے کہ تلخ حقائق سے بچنے کے لیے مطالعہ ایک نعمت ہے۔

ان دنوں تو مطالعہ میرے لیے ازبس ضروری تھا دفتری حقائق سے فرار کا ایک ہی راستہ تھا۔ پھر بھی مَیں زبردستی کتاب پڑھتا تھا۔ بار بار دفتری حالات سامنے آ کھڑے ہوتے۔ مطالعے کا عمل رُک جاتا دل پر ایک ٹھیس سی لگتی پھر اندیشوں کی لہریں رینگنے لگتیں۔ سُرخ چیونٹے میری طرف یورش کرتے پھر سارے جسم میں خوف کی ڈھنکی بجتی۔

اُس روز پتہ نہیں کیا ہوا۔ کتاب ہاتھ میں اُٹھائے میں بیٹھا رہا۔ سوچتا رہا۔ حالانکہ عام طور پر میں سوچنے سے گریز کرتا ہوں۔ کیونکہ سوچ مجھے دِل خراش وسوسوں کی طرف بہا کر لے جاتی ہے۔۔۔ پھر وہی ٹھیس۔۔۔ وہی چیونٹے۔۔۔ وہی ڈھنکی۔ اس روز میں سوچ رہا تھا لیکن ذہن میں کوئی بات نہ تھی جیسے ذہن کلفتوں رنجشوں اور خوشیوں سے بے نیاز ہو

چکا ہو۔ ماؤف ہو چکا ہو۔

ذہن خیالات سے خالی تھا۔ کوئی تلخی نہ تھی، ٹھیس نہ تھی، چیونٹے نہ تھے، دُھنکی نہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میں خلا میں ٹنگا ہوا ہوں اور یہ خلا بے نام سکون سے بھرا ہوا ہے۔ مطالعہ کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ جب کوئی خوف ہی نہ ہو تو فرار کیسا نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔ ایسی خوشگوار فضا کو چھوڑ کر کون سوئے۔

اگلے روز جب نیند سے بیدار ہوا تو۔۔۔ ارے میں چونکا۔۔۔ عام طور سے جب میں جاگا کرتا ہوں تو یوں تھکا ٹوٹا ہارا ہوا اُٹھتا ہوں جیسے کوئی مار کھا کر اُٹھا ہو۔ اُس روز میری کیفیت کچھ ایسی تھی جیسے گیس بھرا غبارہ ہو۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے پھول کمرے میں آ گھسے ہوں۔ چڑیاں چہک رہی تھیں اور سورج کھڑکی میں کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ارے یہ کیا۔۔۔ میں گھبرا کر اُٹھ بیٹھا یہ کیسی صبح ہے۔ کیا میں، مَیں ہی ہوں یا کوئی اور ہے۔ ساتھ ہی مجھے غصہ آنے لگا۔ یہ کون ہے جو میری شخصیت کو بدل رہا ہے۔ کیوں۔

پھر کوئی ان جانا ہاتھ بڑھا اور اس نے مجھے تھپکنا شروع کر دیا۔ جیسے تھپک تھپک کر مجھے وسوسوں سے دُور لے جا رہا ہو۔ سارا کمرہ اس تھپک سے بھر گیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ ہاتھ ماں کا ہاتھ ہو۔ وہ مجھے تھپک رہی ہے۔ سو جانے کے لیے نہیں بلکہ جینے کے لیے۔ سارا کمرہ جینے کی لذت سے بھرا ہوا تھا۔ میں ہکا بکا رہ گیا۔

پھر دفتر گیا وہاں بھی سب کچھ بدلا ہوا تھا۔ تذلیل و تضحیک کی باتیں یوں سُنائی دے رہی تھیں جیسے دُور سے آ رہی ہوں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ باتیں میرے متعلق نہیں بلکہ کسی اور کے بارے میں تھیں۔ ذہن میں ایک اطمینان سا تھا۔ میری میز کے گرد ایک تبسّم گھیرا ڈالے کھڑا تھا۔

آج بھی میرا سارا گھر اسی تبسم سے بھرا ہوا ہے۔ رات کو سوتا ہوں تو وہ میری چارپائی پر بیٹھا مجھے تھپک رہا ہوتا ہے۔ جاگتا ہوں تو وہ میرے سرہانے کھڑا مسکرا رہا ہوتا ہے، کام کرتا ہوں تو وہ میرے پاس بیٹھا اپنی گڈول کی شعاعیں بکھیر رہا ہوتا ہے۔ باہر جاتا ہوں تو وہ مجھے دروازے پر چھوڑنے آتا ہے۔ واپس آتا ہوں تو دہلیز پر بیٹھا میرا انتظار کر رہا ہوتا ہے۔ کبھی

کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ اُس نے میری ذاتی زندگی کو کیوں تہس نہس کر رکھا ہے۔ غصے میں میری کنپٹیاں بجنے لگتی ہیں۔ یہ سب کیا ہے تُم کون ہو۔ کیوں ہو۔ بولو۔ جواب دو۔

اس نے زبان سے مجھے کبھی جواب نہیں دیا۔ وہ گونگا ہے۔ اس کے وجود سے شعاعیں سی نکلتی ہیں۔ ایک لطیف سی لرزش میرے بند بند سے ٹکراتی ہے۔ جسم میں ایک ٹک ٹک بجنے لگتی ہے۔ پھر احساسات کا ایک دھواں سا اُڑتا ہے میرے سوال کی ساری تلخی نچڑ جاتی ہے۔ مٹھاس کی اِک پھوار پڑتی ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے میرے سوال کا جواب مل گیا ہو۔

اُس نے کبھی میری مَیں، میں ردّ و بدل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میری غلاظت پر کبھی ناک نہیں چڑھائی۔ میری کج فہمیوں اور کج رویوں کا نوٹس نہیں لیا۔ لیکن میری انا کے غلیظ گوشوں پر جب اس کی روپہلی روشنی پڑتی ہے میں ان گوشوں کو دیکھتا ہوں تو میرا دل کراہت سے بھر جاتا ہے۔ سر احساسِ ندامت سے جھک جاتا ہے۔

پھر میری انا کا تڑخا ہوا بُت سر اُٹھاتا ہے نہیں نہیں میں ان گوشوں کو صاف نہیں کروں گا نہیں کروں گا۔ میں جیسا بھی ہُوں۔ ہُوں۔ مجھے خود پر کوئی ندامت نہیں ہے۔ میں ایسے ہی جینا چاہتا ہُوں۔ مجھے اپنی مَیں سے پیار ہے میں اپنی مَیں کو نہیں بدلوں گا۔ کسی کو مجھے بدلنے کا حق نہیں۔

ٹھیک ہے ٹھیک ہے فضا سے ایک سرگوشی اُبھرتی ہے۔ کوئی بات نہیں کوئی بات نہیں۔۔ اردگرد کی فضا مجھے تھپکتی ہے۔

تُو کیوں میری ہر بات مانے جا رہا ہے۔ کیوں۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا۔ ضرور اس میں کوئی چالاکی ہے۔ جواب میں سارا کمرہ ایک بے نام لطیف تبسم سے بھر جاتا ہے۔ بے شک اس نے مجھے اپنا رکھا ہے لیکن میں۔ میں اسے کبھی نہیں اپناؤں گا۔ کیوں اپناؤں۔ کیوں کہ مجھے پتہ ہے وہ اپنی رواداری سے، ہمدردی سے، محبت سے میری مَیں کو توڑ دے گا۔ پھر میرے پلّے کیا رہ جائے گا۔

آج تک اس نے مجھ سے کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ صرف ایک مطالبہ۔ وہ بھی مطالبہ نہیں چونکہ اس میں مطلب نہیں منّت ہی منّت ہے۔

اُس کا کہنا ہے اپنے دُکھوں وسوسوں پریشانیوں غموں اور تکلیفوں کی گٹھڑی خود نہ اُٹھا۔
مجھے سونپ دے۔ مجھ پر بھروسہ کر۔ خود کو میرے بھروسے پر چھوڑ دے۔

جب مَیں اپنے فکروں کی گٹھڑی سر پر اُٹھائے گھر پہنچتا ہوں تو گھر کی فضا میں ایک اِرتعاش سا پیدا ہو جاتا ہے۔ میرے گرد چاروں طرف سے منّت بھرے ہاتھ لپکتے ہیں۔ یہ گٹھڑی مجھ پر لاد دے مجھے دے دے۔ خود نہ اُٹھا۔ فضا سرگوشیوں سے بھر جاتی ہے۔ مِنّتوں کا اِک طوفان اُمڈ آتا ہے۔ مجھ پر بھروسہ کر۔

نہیں نہیں، گٹھڑی مَیں اُس کے حوالے کیوں کروں۔ یہ میری گٹھڑی ہے۔ میری ساری زندگی کی کمائی ہے۔ مجھے اپنی مشکلات سے عشق ہے اپنی فکرمندیوں سے محبت ہے۔ میں بڑی محنت سے اپنے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرتا ہوں۔ بڑے شوق سے اپنے راستوں پر خاردار پودے اُگاتا ہوں تاکہ اپنی آبلہ پائی پر بیٹھ کر روسکوں یہی میری سب سے بڑی عشرت ہے۔

یہی میری سب سے بڑی لذّت ہے۔ میں اپنے دُکھوں کی گٹھڑی کیسے اُسے تھما دوں۔
میں تو شک کا دیوانہ ہوں۔
میں کس طرح اس پر بھروسہ کرلوں۔
چاروں طرف سے میری جانب ہاتھ لپکتے ہیں۔
مِنّتوں سے سارا کمرہ بھر جاتا ہے۔
کب سے یہی ہوتا آرہا ہے۔
وہ مِنّتیں کر کر نہیں ہارا۔
میں دھمکیاں دے دے کر ہارتا جارہا ہوں۔
مجھے ڈر ہے کہ میں اپنے دُکھوں کی گٹھڑی اُس کے حوالے نہ کردوں۔ مجھے ڈر ہے کہ میں اُس پر بھروسہ کر کے بیٹھ نہ جاؤں۔
صاحبو کیا وہ کبھی مجھ سے مایوس نہ ہوگا۔

-☆-

اَن پُورنی

پتہ نہیں:

یہ کایا پلٹ کیسے ہوئی۔ لیکن کایا پلٹ جب بھی ہوتی ہے ایسے ہی ہوتی ہے کچھ پتہ نہیں دیتی کہ کیوں ہوئی، کب ہوئی۔ اس گوری کی طرح دبے پاؤں آتی ہے۔ جو پائل کی جھنکار کو بیرن سمجھتی ہو۔

اس کایا پلٹ کے تحت آنند کمار، نہ کمار رہا، نہ آنند رہا۔ پہلے وہ کمار بھی تھا، آنند بھی۔ اس لیے کہ ریاست انگاہ کے مہاراج کا پتر تھا۔ آنند اس لیے کہ کوئی چاہ نہ تھی جو پوری نہ ہوئی ہو۔ اِدھر چاہ کی اُدھر پوری ہوئی۔ یہی آنند ہے نا کہ ہر آرزو پوری ہو جائے۔ نہ انتظار نہ محرومی نہ بے چینی۔ آنند کو پتہ ہی نہ تھا کہ ایسی آرزو بھی ہوسکتی ہے جو پوری نہ ہو۔

زندگی میں پہلی بار اس کے دل میں ایسی آرزو پیدا ہوئی تھی جس کے پورے ہونے کی کوئی صورت نہ تھی یہ آرزو کوئی ایسی مشکل بھی نہ تھی پتلی، دبلی، سوئی سوئی، کھوئی کھوئی، ڈولتی چھوئی موئی خود سے دُور لے جانے والی ایک گائیک تھی۔ ان پورنی۔

ان پورنی جب سے راجدھانی میں آئی تھی اک دھوم مچی ہوئی تھی اس کا چرچا نہ تو رنگ روپ کی وجہ سے تھا نہ گائیکی کی وجہ سے۔ رنگ روپ میں کئی گانے والیاں اس سے بڑھ چڑھ کر تھیں۔ گائیکی میں بھی وہ ایسی جاذب نہ تھی کہ سننے والے تڑپ کر رہ جائیں۔ الٹا وہ تو سنانے کے لیے گاتی ہی نہ تھی۔ نرت لبھانے کے لیے نہ کرتی۔ اپنے قریب لانے کے لیے نہیں۔ الٹا دور لے جاتی۔ گائیکی میں تیرتی نہ تھی ڈوب جاتی تھی۔ جسے خود کی سُدھ بُدھ نہ رہے وہ دُوجے کی سُدھ بُدھ کیا مارے گی۔ ان سب باتوں کے باوجود ان پورنی کی دھوم

مچی تھی۔

شاید بھید یہ تھا کہ ان پورنی میں لوبھ نہ تھا۔ نہ کمانے کا نہ خود کو اچھالنے کا۔ نہ آپ چھلکتی تھی نہ دوجوں پر چھینٹے اڑاتی۔ جلتی ضرور تھی پر مدھم مدھم۔ نما نما گاتی۔ نما نما جیتی۔ جیون میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ نمی نمیاں بھڑک کر جلنے والوں کو ماند کر دیتی ہیں۔ تشنگی کا ایسا دریا بہا دیتی ہیں کہ بڑے بڑے تیراک ڈوب جاتے ہیں۔ آنند بہت بڑا تیراک تھا۔ ڈوبنا نہیں جانتا تھا۔ جسے دھن دولت اور مرتبہ مان کے مشکیزے حاصل ہوں وہ بھلا کیوں ڈوبے۔

آنند نے ان پورنی کی دھوم سنی تو شوق چرایا کہ چلو چل کر دیکھیں جس کی اتنی دھوم ہے وہ ہے کیسی۔ یار دوستوں کی سنگت میں وہ چوبارے میں پہنچا تو اسے دیکھ کر ان پورنی کی نائیکہ کنول نینی کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ بکّی بکّی رہ گئی ہوش آیا تو سواگت میں بچھ بچھ گئی۔ اتنی آؤ بھگت کی کہ وہ اُمیدیں رچا کے بیٹھ گیا۔ پھر ان پورنی آئی۔ ہاتھ جوڑ نمسکار کیا۔ مسکائی، لجائی اور بیٹھ گئی۔ پھر وہ سازوں کی دُھن میں کھو گئی۔ جے جے ونتی کی دُھن تھی۔ پیاں پڑوں گی پلنگاہ نہ چڑھوں گی۔

ایک وہ جسم کی ادھ کِلی تھی دوجے آنکھ ادھ کھُلی تھی۔ دیکھنے والی نہیں دِکھنے والی۔ وہ بھی آدھی اوٹ میں۔ یوں جان لو کہ سامنے ایک ٹمٹمانے والا دیا جل رہا تھا۔

ان پورنی اس کے پاس بیٹھی تھی۔ پر پاس نہ تھی آدھی نہ جانے کہاں۔ گانے میں اتنا گداز جیسے واقعی پیاں پڑی ہو۔ قربت میں اتنی دوری جیسے پلنگاہ چڑھنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا ہو۔

پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے۔ پر ایسا ہوتا ہے جو ساری کی ساری پاس آ بیٹھتی ہیں۔ وہ صرف جسم کا جھنجھنا بجا دیتی ہیں جو پاس ہو کر بھی آدھی نہ جانے کہاں ہوتی ہیں۔ وہ وجود کی سُرتیاں چھیڑ دیتی ہیں۔ ان پورنی نے آنند کے وجود کی سُرتیاں چھیڑ دیں۔ ایک انجانا نغمہ اُبھرا جس سے وہ واقف نہ تھا۔ کیسے واقف ہوتا۔ وہ تو ایسیوں کا شیدائی تھا جو ساری کی ساری پاس آ بیٹھتی ہیں وہ سمجھتا تھا پا لینا ہی دولت ہے۔ نہ پانے کی عظمت سے واقف نہ

تھا۔

اس رات آنند راج بھون واپس پہنچا تو وہ اکیلا نہ تھا۔ ان جانے میں ان پوری کو ساتھ لے آیا تھا۔ خود پر بڑا برہم تھا۔ یہ مجھے کیا ہوا بکھرا بکھرا کیوں ہوا۔ اس نے وہ رات ٹہل ٹہل کر کاٹی۔

پھر کئی ایک راتیں ٹہل ٹہل کر کٹیں۔ پہلے خود سے لڑتا جھگڑتا رہا۔ نہیں نہیں کوئی بات ہے کہ چوبارے بیٹھی دو ٹکے کی چھوکری راج کمار کو اُلتھ پُلتھ کر رکھ دے۔ لیکن خود سے کوئی کب تک لڑے گا۔ آخر ایک رات اپنے خاص نوکر سیوک ناتھ کو بلایا۔ سیوک ناتھ جا۔ ابھی جا گاڑی جوت کر ساتھ لے جا۔ موتی بازار سے ورے ورے گاڑی کھڑی کر دیجیو۔ پیدل ان پورنی کے چوبارے میں جائیو۔ نائیکہ کنول نینی سے کہیو راج کمار، ان پورنی کی راہ دیکھ رہے ہیں۔۔۔ اور دیکھو گاڑی محل کے صدر دروازے پر نہ آئے۔ بات نہ نکلے کنول نینی کو پتہ چلا تو اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ بھاگی بھاگی ان پورنی کے پاس گئی۔ دھن بھاگ پُتری جو تو آج کی رات جاگی جاگی کاٹے، سوئی سوئی نہ رہے تو کیا پتہ کل رانی بن جائے بیچاری کنول نینی کو کیا پتہ تھا کہ جاگی نے نہیں ادھ سوئی نے جوت جگائی ہے جوانی میں کنول نینی خود کٹورہ سی کھلی آنکھ والی تھی۔ مدھ بھری ادھ کھلی کے چمتکار سے واقف نہ تھی۔

ان پورنی راج بھون میں یوں داخل ہوئی جیسے سپنا دیکھ رہی ہو سہمی ہوئی گھبرائی ہوئی۔ ہوائیاں اڑی ہوئیں۔ اس نے اردگرد کی جانب نہ دیکھا۔ محل کی سج دھج پر دھیان نہ دیا۔ کمار کی آنکھوں میں کُھبنے کی بجائے اپنی آنکھیں چرائے رکھیں۔ ہاتھ جوڑے کھڑی رہی۔ کمار بولا آؤ ان پورنی بیٹھو۔ یہ سن کر وہیں فرش پر ڈھیر ہو گئی۔ کمار بھی اس کے پاس فرش پر بیٹھ گیا۔

کمار بولا ان پورنی تُو نیچے کیوں بیٹھ گئی۔

بولی مہاراج میری جگہ ہے وہیں بیٹھتی نا۔ آپ کے چرنوں میں۔

ہم نے تجھے پلنگاہ پر بیٹھنے کو بلایا ہے۔

بڑی کرپا ہے مہاراج پر میں اس جوگی نہیں۔

جوگی نہیں کہ پلنگاہ چڑھنے کو اپمان جانتی ہے۔ کمار نے طعنہ دیا۔

نہ مہاراج وہ بولی جد مان ہی نہیں تو اپمان کیسے ہوگا۔ پلنگاہ چڑھنا تو ویشیا کا دھندہ ہے مہاراج۔

دھندہ ہے تو گھبراہٹ کیوں۔

اس دھندے جوگی نہیں مہاراج۔

کچھ کمی ہے کیا۔

پتہ نہیں مہاراج بُت چڑھتا ہے۔ چت نہیں چڑھتا۔

کمار یہ سن کر ٹھٹھکا پھر بولا چت کہیں لگا ہے کیا۔

نہ مہاراج۔

یہ کیسے ہوسکتا ہے ان پورنی۔

پتہ نہیں مہاراج کہ ایسے کیوں ہے۔ پر ایسے ہی ہے۔ میں نام کی ان پورنی نہیں جیو کی بھی ان پورنی ہوں اپنے آپ میں پورن نہیں ہوں۔

کیا مطلب آنند نے پوچھا۔

ادھوری ہوں مہاراج، آدھی ہوں، آدھی نہیں ہوں۔

میں نہیں سمجھا وہ گنگنایا۔

میں آپ نہیں سمجھی مہاراج آپ کو کیسے سمجھا دوں۔

وہ چپ ہوگیا۔

یوں سمجھ لیجیے مہاراج وہ گنگنائی کہ چھٹی کے چاند اسمان ہوں آدھی ادھر ہوں آدھی پتہ نہیں کدھر ہوں۔ پلنگاہ پر وہ براجمان ہوتی ہیں مہاراج، جو پورن ماشی کے چندا کی طرح پورن ہوتی ہیں۔ ان پورنی بیچاری پلنگاہ پر کیا چڑھے گی۔ چڑھی نہ چڑھی برابر۔ وہ چپ ہو گئی۔ سیس نوائے نین جھکائے بیٹھ رہی۔

اس کی باتیں کمار کے ہردے پر چیونٹیوں کی طرح چڑھ گئیں۔ دل میں دھنس گئیں۔ اتنا پسیجا کہ جواب دینا بھول گیا۔ پتہ نہیں کس بات پر۔ لاج پر جواَن پورنی کے مکھ پر گھٹا

بن کر چھائی تھی، بھولپن پر یا سچ کی باس پر جو اس کے منہ سے نکلی ہوئی باتوں میں یوں رچی مچی تھی جیسے پیاز میں آنسو رچے ہوتے ہیں۔

آنند کو چپ لگ جائے تو اتنی دور لے جاتی ہے کہ واپس آنا مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر پورن بندہ بھی ان پورن ہو جاتا ہے۔

کمار اور ان پورنی دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔ بیٹھے رہے۔ سیوک ناتھ نے کئی بار باہر سے جھانکا۔ بیچارہ حیران۔ اندر دو بُت بیٹھے تھے۔ ایک دوجے کے پاس۔ ایک دوجے سے دور۔ بہت دور جیسے ایک دوجے کی خبر نہ ہو۔

سیوک ناتھ سمجھتا تھا کہ راج کمار جو کئی دنوں سے کھویا کھویا نظر آ رہا تھا۔ ان پورنی کے آنے پر پورا ہو جائے گا اسے اپنا کھویا آدھا پھر سے مل جائے گا۔

پہلے بھی کئی بار ایسا ہوا تھا۔ راج کمار پر بے چینی کے بادل چھائے تھے۔ پھر کوئی چتر نینی آئی پلنگاہ چڑھی۔ پھلجھڑیاں چلیں، ہوائیاں چھوٹیں، رنگدار چکر گھومے جھولے پھر سارا کمرہ جگ مگ جگ مگ ہو گیا تھا۔ پر آج یہ کیا ہو رہا ہے۔ دونوں ہی بُت بیٹھے ہیں ایسا تو کبھی نہیں ہوا۔ جد توڑی پجاری نہ ہو بت بت کیسے بنے۔ پھر دو بت کیسے بن گئے۔ بھگوان تیری لیلا تو ہی جانے۔

جب آنند کمار واپس اپنے آپ میں آیا تو وہ نہ رہا تھا جو چپ ساگر میں ڈوبنے سے پہلے تھا اور اس کی نظر میں ان پورنی، وہ ان پورنی نہ رہی تھی جو پلنگاہ چڑھانے کو بلائی گئی تھی۔ ان پورنی آنند بولا۔ سہمی سہمی کیوں بیٹھی ہے۔ چنتا نہ کر جو تو چاہے گی وہی ہوگا۔

ان پورنی چاہے ادھوری تھی پر استری تھی۔ اس نے دیکھا کہ مائع اتر گئی ہے نظر ڈھل گئی ہے۔ آواز نچلے سُروں پر گر گئی ہے۔ لے بلمپت ہو گئی ہے۔ سُر میں کامنا کی جگہ براہ کی مینڈھ لگ گئی ہے۔

ان پورنی وہ بولا جو میں تجھے اپنا بنانا چاہوں تو۔۔۔

مہاراج میں وِدھوا ہوں۔

وِدھوا۔ وہ چونکا۔

ویاہ ہوا تھا۔ مہاراج وہ بولی۔ پھیرے ہوئے تھے خوشی میں ٹھاہ ٹھاہ بندوقیں چلیں۔
اک گولی چوک کر پران پتی کو لگی۔ بھاگیہ کا لکھا پورا ہوا۔ میں ان پورن رہ گئی۔

اوہ۔۔۔ کمار کو ٹھیس لگی۔ پھر۔۔۔ اس نے پوچھا۔ اگرچہ اس کے حلق میں آواز نہ رہی تھی۔ پھر۔۔۔ کلمونہی بنی۔ ابھاگن بنی۔ نحس گنی گئی۔ اتنی نندا ہوئی کہ سہار نہ سکی۔ گھر چھوڑ کر چلی آئی۔

کمار کو پھر چپ لگ گئی۔ پھر دو بت بن گئے۔ رات بیت گئی۔ بھور سمے ہو گیا تو آنند جاگا۔ اسے جاگا دیکھ کر وہ بولی مہاراج بھور سمے ہو گیا ہے۔ لوگ جاگن لگے۔

وہ اُٹھ بیٹھا۔ ہاں جانے سے پہلے اک بات بتاتی جا۔ جی مہاراج وہ بولی۔

جیون میں کوئی ایسی چیز ہے جس کی تجھے چاہ ہے، ڈھونڈ ہے، لگن ہے۔

ہاں مہاراج وہ بولی۔ اِک سُر ہے مہاراج جس کی مجھے چاہ ہے، ڈھونڈ ہے جو مجھے اَن پُورنی سے پُورنی کر دیتی ہے۔ ٹُوٹ جوڑ دیتی ہے۔ اس سُر کے کارن میں چوبارے چڑھی دھندہ اپنایا۔

سُر کیا ہوتی ہے، کہاں ہوتی ہے، کیسے حاصل ہوتی ہے۔

اس دن سے آنند کمار کو ڈھونڈ پڑ گئی۔ سُر کی ڈُھونڈ۔

ڈھونڈ کتنی بڑی دین ہے جو جوہڑ کو ندی بنا دیتی ہے جو گڑی کشتی کو پتوار دے دیتی ہے جو زندگی کو سمت بخش دیتی ہے۔

کسی نے کہا مہاراج کانتاونتی سے پوچھو۔ شہر میں وہی سُر کی رانی ہے۔

کانتاونتی ہنسی، بولی۔ راج کمار کو کس نے کہا کہ میں سُر کی رانی ہوں۔ نہ مہاراج میں تو سُر کی داسی بھی نہیں ہوں۔ میں تو جیون بھر سُر انجان رہی۔ بول کے بندھن میں پھنسی رہی۔ مہاراج چوبارے کی گائیک سُر کو کیا جانے گی۔ سننے والے تو بول کے متوالے ہیں سُر کی سار نہیں جانتے۔ وہ تو لفظ کے پجاری ہیں۔ ایسے لفظ ہوں جو تن کو چنگاری دکھا دیں۔ ہردیے کو پھلجھڑی بنا دیں اور خود شریر کی رنگ پچکاری میں بھیگ جائیں۔ بس یہی ان کی چاہ ہے۔ مہاراج وہ آنکھ نہیں دیکھتے اس کا مٹکنا دیکھتے ہیں۔ شیشہ نہیں دیکھتے اپنی مورت دیکھتے

ہیں۔

تو پھر شہر میں کون ہے جو سُر کا پتہ دے سکے آنند کمار نے پوچھا۔

نہ مہاراج کانتا بولی۔ شہر میں نہیں۔ شہر تو مہاراج تن کا پن گھٹ ہے۔ جہاں ہردے کی جھجھریاں بھری جاتی ہیں۔ شہر تو تن کا بیوپاری ہے۔ تن کا پجاری ہے اور سُر مہاراج وہ تو جمگھٹ کی چیز نہیں۔ اکیلے کی چیز ہے۔ بَن کا کوئی جھنڈ ہو۔ پہاڑ کی کوئی کھوہ ہو۔ ویرانے میں کوئی مندر ہو وہاں کوئی سُر کا پجاری مل جائے تو دھن بھاگ۔

کانتا سے ملنے کے بعد آنند کی سُر لگن اور بڑھ گئی۔

اتفاق سے سوامی ہمیش چندر شہر آ گئے۔ ان سے جا ملا۔ سوامی بولے پُتر یہ تو کس جھنجھٹ میں پڑ گیا۔ سُر کا تو کوئی انت نہیں یہ ساری رام لیلا جو ہے یہ سُر کا ہی چمتکار تو ہے۔ کرشن مہاراج بانسری بجا رہے ہیں اور ہمارے سامنے یہ تماشا ہو رہا ہے۔ سُر کی رچنا جاننا چاہتے ہو پُتر تو گوالکا پربت پر تلسی مہاراج کے مندر وا جاؤ اگر تمہارے من کا کان بند نہیں تو سارا بھید کھل جائے گا۔

آنند کمار سوچتا رہا پھر اس نے فیصلہ کر لیا۔ پھر وہ مہاراج سے جا ملا۔ بولا پتا جی مہاراج میں یاترا جانا چاہتا ہوں آ گیا دیجیے۔

یاترا۔ کیسی یاترا مہاراج نے پوچھا۔

مہاراج میں گوالکا پربت پر تلسی مہاراج کے مندر وا کے درشن کرنا چاہتا ہوں۔

مہاراج کے ماتھے پر تیوری پڑ گئی۔ انگاہ کے راج کمار کو تلسی مہاراج کی لگن کیسے لگ گئی۔ اچھا وہ بولے۔ ہم وچار کر کے بتائیں گے۔

راج کمار کے یاترا جانے کی بات سارے محل میں گونجی۔ باتیں ہوئی۔ ہاتھ چلے سینے تھام لیے گئے۔ انگلیاں ہونٹوں پر رکھی گئیں۔ راج رانی نے کہا۔ مہاراج ضرور اس میں کوئی بھید ہے۔ کمار کے بھیدی نوکر کو بلایا گیا۔ بھید کھلنے کے بجائے اور الجھ گیا۔ سیوک ناتھ بولا مہاراج ساری شرارت ان پورنی کی ہے اس نے راج کمار کو بت بنا دیا ہے۔ ان پورنی کو حاضر کیا گیا۔ وہ بولی مہاراج میں نے تو کچھ نہیں کیا۔ مہارانی بولی۔ بس تو نے غضب کیا کہ

کچھ نہ کیا۔ کچھ نہ کر کے تو نے کمار کا دل اچاٹ کر دیا۔ اب جا کچھ کر، کوئی جتن کر، ویرانے سے ہٹ کر آبادی کی طرف دھیان لگے۔ یاترا کی لگن ٹوٹ جائے۔

اسی رات ان پورنی راج کمار کے چرنوں میں جا بیٹھی۔ آپ میرے کارن جا رہے ہیں ناراج کمار اس نے پوچھا۔

ہاں تیرے کارن۔

تو نہ جائیے۔ میں داسی بن کر آپ کے ساتھ رہوں گی۔

مجھے داسی نہیں چاہیے۔

ان پورنی آپ کی سنگ ساتھن بن کر رہے گی۔

جاؤ لڑکی مجھے ان پورنی چاہیے وہ پورنی جسے میں خود سُر سے پورن کروں۔ ان پورنی نے بڑے جتن کیے پر آخر جان لیا کہ بات اس کے بس سے نکل چکی ہے۔

مہاراج کو پتہ چل گیا کہ راج کمار نہیں رُکے گا۔ روکا گیا تو ٹوٹ جائے گا۔ پھر لوٹ آنے کی صورت بھی نہ رہے گی۔ اس لیے انہوں نے آگیا دے دی۔ ساتھ چھ ایک نوکر کر دیئے انہیں تاکید کر دی کہ ساتھ ساتھ رہیں نظر سے اوجھل نہ ہونے دیں۔

ان پورنی راج کمار کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہوا تو دفعتاً اس نے جانا کہ وہ تو پورن ہو گئی ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ کمار راج پاٹھ چھوڑ کر سُر کی نہیں بلکہ اس کی ڈھونڈ پر نکلا ہو۔ اس خیال پر وہ اتنی خوش ہوئی کہ پورن ہو گئی۔ پر یہ خوشی شانت کرنے والی خوشی نہ تھی بلکہ بے کل کرنے والی تھی۔ سو وہ بے کل ہو گئی۔

ایک سال بیت گیا اس کی بے کلی بڑھتی گئی۔

پھر ایک دن راج کمار کے ساتھ گئے ہوئے پانچ نوکر واپس آ گئے۔ بولے مہاراج ہم نے تو کمار کا بڑا دھیان رکھا پر ایک رات راج کمار سیوک ناتھ کو ساتھ لے کر چلے گئے۔ ہم سوتے ہی رہ گئے پھر ہم نے ڈھونڈ کی۔ آس پاس کو چھان مارا پر کوئی بھولا ہوتا تو گھر آتا۔

ان پورنی نے سنا تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ چار ایک دن ٹھنڈی برف پڑی رہی

پھراٹھی۔اب میں یہاں کس لیے بیٹھی ہوں۔اب یہاں کون آئے گا۔جس ڈھونڈ پر میں خود نکلی تھی دوجے کو اس ڈھونڈ پر لگانے کا مجھے کیا ادھیکار تھا۔سارا دوش میرا ہے اس نے دھندے کو سمیٹا اور چل نکلی۔جگہ جگہ گھومی مندر مندر ٹھکانہ کیا۔

میگھ مندر میں شری ہمیش چندر مل گئے۔

بولے پتری تو یہاں میگھ مندر کے ویرانے میں کیا کر رہی ہے۔

ان پورنی بولی۔مہاراج سُر کی ڈھونڈ میں نکلی ہوں۔

نہ پتری وہ بولے۔تو سُر کی ڈھونڈ کیسے کرے گی تُو تو صرف دکھ سے واقف ہے۔سُر کی ڈھونڈ تو وہ کر سکے ہے جو دُکھ کے ساتھ سُکھ سے بھی واقف ہو۔جولو بھ لگن بیت چکا ہو۔رنگ رلیاں منا چکا ہو۔جیون کی موم بتی دونوں سروں پر جلا کر دیکھ چکا ہو۔

مہاراج۔وہ بولی میں نے بھی تو رنگ رلیاں منائی تھیں۔میں تو ویشیا تھی۔پلنگاہ چڑھتی رہی۔

اُوں ہُوں وہ مسکائے ویشیا خالی تن کی نہیں ہوتی۔تن من دونوں کی ہوتی ہے۔تیرا چت تو بُت میں نہیں ہے۔تو کیسے ویشیا بنتی۔نہ نہ پتری پہلے اپنے آپ کو جانو پھر ڈھونڈ پر نکلو اور پھر اپنا آپ تیاگ کر سب کچھ پالو۔یہی ڈھونڈ کا بھید ہے اور پتری تو استری ہے۔استری سُر کی ڈھونڈ پر نہیں نکلتی۔سُر والے کی ڈھونڈ پر نکلتی ہے۔ان پورنی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔گردن لٹک گئی۔یہ دیکھ کر سوامی بولے تو ریاست انگاہ کی ہے کیا۔ہاں مہاراج پورنی گنگنائی۔وہ بولے تو نے ہی راج کمار کو سُر کی ڈھونڈ پر لگایا تھا۔وہ چپ ہو گئی۔وہ مسکائے بولے جا پتری اس کی ڈھونڈ کر جس کی ڈھونڈ پر نکلی ہے۔خود کو دھوکا نہ دے۔خود ساتھ نہ دے تو ڈھونڈ کبھی پورن نہیں ہوتی۔

اس رات ان پورنی سوچوں میں پڑی رہی۔رو رو کر بے حال ہو گئی۔ہے بھگوان میں کیا کروں۔کس کی ڈھونڈ کروں۔

پھر وہ مندر مندر پھری۔دیوی دیوتا کے چرنوں میں بیٹھ کر روئی۔ہاہا کار کی، ہے دیوتا مجھے بھگوان کی ڈھونڈ دے دو۔نہ سُر رہے نہ سُر والا رہے۔نہ بانس رہے نہ بانسری۔لیکن

سیس نوا کر جب وہ سر اُٹھاتی تو دیوتا کے جسم پر آنند کمار کا مکھ سجا ہوتا۔

وہ جگہ جگہ پھری۔ استھان استھان گھومی۔

بھگوان کی لگن کے لیے بھجنوں کے بہانے روئی پیٹی لیکن ہر دیوی دیوتا کے بت پر آنند کمار کا مکھ لگا رہا۔

آخر وہ ہار گئی۔ ڈھونڈ چھوڑ مادھوری کے ویران مندر میں اک کوٹھڑی میں پڑ رہی۔

ہے بھگوان جو تو چاہے دے، نہ چاہے نہ دے پر میرے راستے کا پتھر تو ہٹا دے پاؤں کی بیڑی تو کاٹ دے۔ ایک روز مادھوری مندر کی بوڑھی پجارن دوڑی دوڑی آئی۔ بولی پتری دو سوامی آ رہے ہیں۔ تو دو بڑی کوٹھڑیاں صاف کر دے وہ کچھ دناں یہاں ٹکیں گے۔

کون آ رہے ہیں پجارن۔ اَن پُورنی نے پوچھا۔

ایک تو سوامی آنند کمار ہیں جو اوپر تلسی مہاراج سے آئے ہیں۔ یہ سن کر ان پورنی کا دل دھک سے رہ گیا باجو کانپا جھاڑو گر گیا۔

پجارن نے دیکھا۔ ہے بھگوان۔ ہردے میں اتنی بھیڑ۔ وہ دیکھ نہ سکی۔ منہ پھیر لیا۔ ان دیکھا کر دیا۔ بات جاری رکھی تا کہ دیکھن کا بھید نہ کھلے۔ بولی دوجے سوامی ہمیش چندر ہیں نیچے نارائن نگر سے پدھاریں گے۔

جب سوامی آنند کمار پہنچے تو مندر کی ساری پجارنوں نے باہر نکل کر ان کا سواگت کیا۔ لیکن ان پورنی اپنی کوٹھڑی سے نہ نکلی۔ وہ کواڑ کی درز سے دیکھتی رہی۔۔۔ ہاں، وہی۔ وہی ناک نقشہ، وہی روپ سروپ لیکن جیسے ہوا بدلی بدلی ہو۔۔۔ ان کے پیچھے پیچھے وہی ان کا نوکر سیوک ناتھ تھا۔

جب شام پڑی تو وہ سیوک ناتھ کے پاس گئی ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا۔ سیوک ناتھ نے پرنام کا جواب دیا۔ بولی تو نے مجھے پہچانا۔۔۔ میں ان پورنی ہوں۔ مجھے سوامی سے ملا دے۔

سیوک ناتھ بولا۔ ان پورنی کوئی اور مانگ، مانگ یہ مانگ میرے بس کی نہیں۔

سوامی راہ چلتے مل لیں ویسے کسی سے نہیں ملتے۔

تُو اِک بار کہہ کر تو دیکھ کہ ان پورنی آئی ہے۔

جرور کہوں گا۔ وہ بولا۔

سیوک ناتھ نے ایک بار کہا دو بار کہا تین بار کہا پر کچھ نہ ہوا۔

کچھ نہیں ہوا۔ ان پورنی نے پوچھا۔

اُوں ہُوں سیوک ناتھ نے سر ہلا دیا۔

سوامی جی نے سنا نہیں وہ بولی۔ ٹھہر میں اپنا نام پتر پر موٹا موٹا لکھ کر لاتی ہوں۔ تو سوامی جی کے ہاتھ میں پتر تھما دیجیو۔ سیوک ناتھ پتر اندر لے گیا۔ باہر نکلا تو ان پورنی نے پوچھا۔ کیوں کچھ ہوا۔

ہاں ہوا۔ وہ بولا۔ ان پورنی کا مُکھ کِھل گیا۔ سیوک بولا۔ سوامی جی نے پتر کو دیکھا۔ بولے کون ان پورنی۔

ان پورنی سن کر وہیں گھاس پر ڈھیر ہو گئی۔

اگلے روز وہ پھر سیوک ناتھ کے پاس آئی۔ بولی بس ایک بار اور سیوک ناتھ ایک بار۔

آخری بار سوامی سے جا کر کہو۔ وہ ان پورنی جسے تم نے چلتے سمے کہا تھا۔ ان پورنی میں تجھے آپ سُر سے پورن کروں گا۔

ان پورنی نے بات پوری کر کے سر اٹھایا تو دیکھا کہ سیوک ناتھ کے پیچھے سوامی ہمیش چندر کھڑے مسکا رہے ہیں۔ سوامی بولے۔ ان پورنی اب بیکار ہے پتری۔ اب تیرے لیے وہاں کچھ نہیں دھرا۔ پہلے وہ پورن تھا۔ پر تو نے اسے سُر کی ڈھونڈ دے دی۔ وہ تیری خاطر سُر ڈھونڈتا رہا۔ جو سُر پانے سے پہلے تو اسے اپنا لیتی تو اپنا لیتی۔ پرنتو اس نے سُر کا بھید پا لیا اور سُر نے اسے ان پورن کر کے بھگوان کی ڈھونڈ پر لگا دیا۔ اب وہ تیری خاطر نہیں اپنی خاطر ڈھونڈ میں لگا ہے اب وہ کیا جانے کہ ان پورنی کون ہے۔

ان پورنی کی چیخ نکل گئی۔

مندر کی پجارن باہر نکل آئی۔ کیا ہوا۔ یہ آواج کیسی تھی۔

کچھ نہیں سوامی ہمیش بولے اس پُتری کے راستے کا پتھر ہٹ گیا۔ اسے رستہ مل گیا۔ یہ جا رہی ہے پجارن اسے وداع کرو۔ لیکن پجارن نے ان پورنی کی طرف دیکھ کر کہا۔ یہ آنسو۔ سوامی ہمیش مسکرائے۔ بولے یہ خوشی کے آنسو ہیں۔ جاؤ پُتری۔ اب تم آزاد ہو۔ پاؤں کی بیڑی کٹ گئی۔ دھن بھاگ تمہارے۔

-☆-

پِک نِک

مائی گاڈ، اتنی سجاوٹ۔ اتنی سجاوٹ دیکھ کر دل دِق ہو جاتا ہے آئی فیل سِک الرجک ہو رہی ہوں۔ سجاوٹ تو اِن سپاٹس اچھی لگتی ہے۔ یہاں ہو وہاں نہ ہو۔ اِدھر سادہ سادہ اُدھر سجا سجا۔ یہ نہیں کہ سارا گھر سجاوٹ سے یوں تھوپ دیا جیسے دیہاتی دیوار پر اُپلے تھوپ دیتے ہیں۔ صاف پتہ چلتا ہے کہ گھر افلونس زدہ ہے۔ افلونس تو خیر ٹھیک ہے۔ لیکن اسے خوامخواہ اُچھالنا۔ اور پھر اتنی گاڑھی نمائش۔ بھئی ہلکی ہلکی رکھو۔ نمی نمی۔ مدھم مدھم۔ سیٹھ گھر نہ لگے۔

پتہ نہیں افلونس کو زندگی سے بیر کیوں ہے۔ اِدھر افلوانس آئی اُدھر زندگی رخصت۔ نہ انفرادیت رہی نہ چمک صرف ٹریڈیشن۔ دیکھ لو یہاں سب مُردے ہیں۔ ٹریڈیشن کی چادر میں کفنائے ہوئے مُردے بائی گاڈ۔ مُشک کافور کی بو آتی ہے۔ سوچتے یوں ہیں جیسے برسوں سے سوچا جا رہا ہے۔ کرتے وہ ہیں جو برسوں سے کیا جا رہا ہے اَونسٹ ٹروتھ یہاں تو کمیونٹی ٹریڈیشن کی ریلز بچھی ہیں۔ سوچ کی گاڑی چلے تو ریلز پر۔ نہیں تو ڈی ریل۔ ختم۔

مانتی ہوں میں کہ پیسہ بڑی چیز ہے۔ چھوٹے چھوٹے آرام آسائشیں خریدو۔ سجاوٹیں کر لو۔ گوٹے کناریاں لگا لو۔ سب ٹھیک لیکن آسائشیں آرام تو دیمک کی طرح چاٹ جاتے ہیں۔ نہ زندگی کی چمک رہتی ہے۔ نہ تڑپ نہ جدوجہد۔ بس آرام اور آسائش کی لحد میں پڑے رہو۔ پڑے رہو۔ اور یہ سب اسے کہتے ہیں۔ لَو اِن کمفرٹ۔ لیکن آرام جینے بھی دے۔ کہتا ہے جیو مگر جیو نہیں، زندگی میں کوئی ہلکی ہلکی بے آرامی ہو۔ بے اطمینانی ہو۔ تھوڑی تھوڑی تکلیف۔ پریشانی۔ کشمکش۔ جدوجہد۔

مائی گاڈ یہ آرام تو مجھے چاٹے جا رہا ہے۔ جو میں نے ابھی ابھی کچھ نہ کیا تو سمجھو ختم۔

دی اینڈ۔ گھر والے سب مجھ سے ناراض ہیں۔ ڈیڈی ممی، بھائی بھابھی، سب۔ ڈیڈی کہتے ہیں۔ انجنا تو ورکنگ وومن نہیں بن سکتی۔ کیوں نہیں بن سکتی بھلا۔ کہتے ہیں ورکنگ وومن وہ ہوتی ہے جس کا کام کرنے کے بغیر گزارہ نہ ہو۔ جو کیپ دی پاٹ بائلنگ کے لیے کام کرنے پر مجبور ہو۔ تم سیٹھانی ہو کام کرنے پر مجبور نہیں ہو اس لیے ورکنگ وومن نہیں بن سکتی۔ لو یہ کوئی آرگیومنٹ ہے بھلا۔ کیا ضروری ہے کہ نیڈی ہو۔ بھئی ورکنگ وومن تو ایک ایٹی ٹیوڈ ہے۔ زندگی کا ایٹی ٹیوڈ۔ چاہے امیر ہو، غریب ہو۔ سلف سفیشنٹ ہو۔ محتاج ہو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

ممی کہتی ہیں ورکنگ وومن بننا تو آج کل کا فیشن ہے۔ لڑکیاں کام نہیں اپنا رہی فیشن اپنا رہی ہیں۔ اِک چاؤ ہے۔ مردوں کے نام چیلنج ہے کہ لو ہم بھی تمہارے ساتھ چلیں گی۔ کندھے سے کندھا جوڑ کر قدم سے قدم ملا کر۔ چار چھ سال یہ چاؤ چلتا ہے۔ پھر شادی ہو جاتی ہے۔ بچے ہو جاتے ہیں۔ بس ورکنگ وومن سوکھ کر جھڑ جاتی ہے۔ اللہ اللہ خیر سلا۔

بھائی کہتے ہیں انجنا یہ تو ایک لائف پیٹرن ہے۔ ٹپ ٹپ چلنا۔ پھنسے ہوئے لباس پہننا۔ آدھے زنانہ آدھے مردانہ۔ کندھے پر تھیلا لٹکانا۔ پٹاخ پٹاخ باتیں کرنا۔ فر فر انگریزی بولنا۔ بٹر بٹر دھوئی دھائی آنکھوں سے دیکھنا۔ اسے کام سے کوئی تعلق نہیں ورکنگ ہو یا نہ ہو۔ پیٹرن ایسا ہو۔ گھڑی چلے نہ چلے پر رسٹ پر بندھی ہو۔

بھابھی کچھ نہیں کہتی صرف مسکرا دیتی ہے وہ تو پیدائشی سیٹھانی ہے لڑکی پن کبھی آیا ہی نہیں۔ ہماری کمیونٹی کی ٹریڈیشن میں پلی ہے نا۔ ہٹاؤ۔ اس کا کیا ذکر۔ بے چاری بنی بجی ڈال ہے۔

ممی کہتی ہے انجنا یہ تو کیسا لباس پہنتی ہے۔ ذرا بھی ڈگنٹی نہیں ہوتی۔ بیٹھتی مرسڈیز میں ہے اور کندھے پر تھیلا لٹکاتی ہے۔ کوئی بات ہے بھلا۔ پتہ نہیں ممی ڈگنٹی کسے سمجھتی ہے۔ بن سنور کر بیٹھ جاؤ یوں کہ زندگی کی ذراسی رمق باقی نہ رہے۔ بالکل مردہ۔ بنی بجی ڈال جیسے بھابھی ہے۔

ممی تو خود ڈیڈ باڈی ہے۔ چلتی پھرتی ڈیڈ باڈی۔ بناؤ سنگھار کر کے بیٹھ رہتی ہے۔

سارا دن حکم چلاتی ہے یہ کرو وہ نہ کرو۔ ایسے کرو ویسے نہ کرو۔ یوں کیوں کیا۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے بھلا۔ بن سج کر پتھر کی طرح بیٹھ رہنا۔ بس منہ کی ایک ٹکڑی ہے اسے دیکھ لو باقی سارا جسم کپّے کی طرح پھولا ہوا ہے۔ کبھی چلے تو جیسے پیپا لڑھک رہا ہے۔ لیکن چلنے کی ضرورت بھی پڑے۔ بیٹھے بٹھائے جو سب کچھ مل جاتا ہے۔ پُر ممی۔

بیٹھے بیٹھے سب کچھ مل جانا کتنی بڑی لعنت ہے۔ مائی گاڈ حلیہ بگاڑ کر رکھ دیتی ہے۔ یہ سب پیسے کا اثر ہے۔ کہتے ہیں پیسہ بنا دیتا ہے۔ جھوٹ۔ یہ بناؤ ہے یا بگاڑ۔ پیسے کا بگاڑ دیکھنا ہو تو اس گھر کو دیکھ لو۔ یہ سجا سجایا مردہ خانہ اور اس میں کفنائی ہوئی لاشیں۔

ہائیں یہ کس نے گھنٹی بجائی۔ اس وقت بھلا کون آئے گا۔ اچھا ارسلان ہے۔ بے چارا۔ اس گھر کے پھیرے لیتا رہتا ہے۔ اچھا لڑکا ہے اونچا لمبا۔ پتلا دُبلا۔ فیئر ہے سمارٹ ہے۔ افیکشنیٹ ہے۔ ٹنڈر ہے۔ سب کچھ ہے لیکن تڑپ نہیں۔ چمک نہیں ارج نہیں میٹھا میٹھا ہے۔ ٹھنڈا میٹھا جیسے صندل کا شربت ہو۔ برف والا۔

ارسلان میرا منگیتر ہے۔ منگنی نہیں ہوئی۔ ویسے نامزد ہوں۔ اس عمر میں اپنا سٹور چلا رہا ہے۔ ڈیڈی کہتے ہیں بڑا ٹیلنٹڈ ہے۔ ہوگا۔ پر میں سٹور نہیں ہوں۔ جسے چلا سکے۔ ساتھی نہیں بن سکے گا۔ کوٹ اُٹھا اُٹھا کر پیچھے چلنے والا ہے۔ قدم ملا کر نہیں۔ اُوں ہُوں۔

دراصل اس کے اندر کا بچہ مر چکا ہے۔ اُوں ہُوں مرا نہیں۔ وہ تو تھا ہی نہیں۔ مرتا کیسے اندر پلے نہیں ساری بات ہی پلے کی ہے۔ میاں بیوی کھیلیں نہیں تو بات نہیں بنتی۔ ارسلان کے گھر میں تو میں ساری عمر ایک ہاتھ سے تالی بجاتی رہوں گی۔

ہئے میرا جی چاہتا ہے کوئی مرچیلا جوان ہو۔ کڑا کے دار دونوں مل کر زندگی کا کھیل کھیلیں۔ کبھی میں اسے جیتنے میں لگی رہوں۔ کبھی اسے کہوں۔ لک ڈارلنگ ڈونٹ ٹیک می فار گرانٹڈ۔ یو ہیو ٹو وِن می اوور ایوری ٹائم۔ پر ایسا ملے بھی۔۔۔ ویسے تو کئی ایک ملتے ہیں۔ بھوکی نظریں ڈالتے ہیں۔ چیپ باتیں کرتے ہیں۔ پتہ نہیں کیا سمجھتے ہیں۔ یہ تو کوئی طریقہ نہیں اثر ڈالنے کا۔

وہ جو کل ملا تھا۔ بس سٹاپ پر۔ میں جو ذرا رُکی تو کھڑکی میں منہ ڈال کر بولا ہمیں بھی

لے چلو ساتھ۔ مجھے بڑا غصہ آیا۔ لیکن اس نے ایسی نگاہ ڈالی کہ میں جھنجھنے کی طرح بجنے لگی۔ اس کی نگاہ میں سرخ چیونٹے تھے۔ تھا بڑا انڈر۔ سو ہاٹ ٹائپ۔

لیکن جو ایسا مل بھی جائے تو گھر والے مانیں گے کیا۔ اُوں ہُوں۔۔۔ یہاں تو باہر والے کے لیے گنجائش ہی نہیں۔ نہ میل ملارا نہ کچھ اور۔ اپنی سیٹھ کمیونٹی میں کر لو جو کرنا ہے۔ رومانس ہو افیئر ہو کچھ ہو۔ سب ٹھیک۔ چاہے کتنی دور نکل جاؤ سب چلتا۔۔۔ لیکن باہر والا۔ اُوں ہُوں۔

کمیونٹی میں سب سوسو ہیں۔ پتہ نہیں کیوں۔ نہ کرارپن، نہ کڑاکا۔ نہ سو ہاٹ۔ پتہ نہیں پیسہ کڑاکے کا دشمن کیوں ہے۔ رسّی کا بل کیوں نکال دیتا ہے۔ پھُس کر کے رکھ دیتا ہے۔ لیکن انجنا۔۔۔ انجنا کا بل کون نکالے گا۔ جل جاؤں گی پر بل نہیں نکلے گا۔۔۔ یہی بل تو زندگی ہے۔ انفرادیت ہے۔۔۔ نو ٹریڈیشن انجنا کیئرز ٹو ہوٹس فار کمیونٹی۔ سب توڑ دوں گی۔ چُور چُور کر دوں گی۔۔۔ مگر کوئی ملے بھی۔

توبہ کسی وقت تو میں اس لڑکی کے تیور دیکھ کر ڈر جاتی ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے گھر میں اجنبی آ گھسا ہو۔۔۔ ویسے بڑی اچھی لڑکی ہے۔ افکشنیٹ ہے۔ ہوم اٹیچڈ ہے۔ ڈیڈی ممی کا خیال رکھتی ہے۔ وَیل بی ہیوڈ ہے۔ مینرز کا بڑا خیال رکھتی ہے۔ سب ٹھیک ہے بس وہ ایک نگاہ۔ ظالم نگاہ۔ اس وقت ایسے لگتا ہے جیسے اُڑنے کے لیے پر تول رہی ہو۔ اس نگاہ میں نفرت نہیں ہوتی۔ اکتاہٹ ہوتی ہے۔ جیسے ہم سب سے بیزار ہو۔ سک۔۔۔ ایسے لگتا ہے مجھے جیسے کچھ کر گزرے گی۔۔۔ یہ طوفان چل کے رہے گا۔۔۔ توبہ کوئی طوفان سا طوفان ہے جبھی تو ڈر جاتی ہوں۔ سہم جاتی ہوں۔

انجنا کے ڈیڈی سے بھی بات کر دیکھی۔ میں سمجھتی تھی سُن کر چونک جائیں گے لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔ جیسے بات سمجھی ہی نہ ہو۔ کہنے لگے مریم تو انجنا کا فکر نہ کر۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ عمر ہی ایسی ہے۔ لڑکیاں بلبلے مارتی ہیں۔ شوں شوں کرتی ہیں۔ پھر شانت ہو جاتی ہیں۔

ہےُ اتنے بے خبر ہیں آپ میں نے کہا۔

وہ مسکرادیئے جیسے کہ ان کی عادت ہے۔ بولے مریم تو نے اس گھر کو نہیں جانا۔ اس گھر کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ یہ گھر ساری شوخی جذب کر لے گا۔ ساری تڑپ کا ٹرانکولائیز کردے گا۔ سیٹھ کے گھر میں کبھی انقلاب نہیں آتا۔ اس طرز زندگی کے تحت اڑان نہیں چلتی پَر کٹ جاتے ہیں۔ یہ ہماری کمیونٹی کی رِیت ہے۔ سب بَل نکل جاتے ہیں۔ سانپ رسی بن جاتے ہیں۔ یہاں کوئی بغاوت نہیں کرسکتا۔ تم بالکل نہ گھبراؤ مریم ساری بات مجھ پر چھوڑ دو۔۔۔ انجنا سے کچھ نہ کہنا۔ اس کی ضد کو نہ چھیڑنا جو کرتی ہے کرنے دو۔ رکاوٹ نہ کھڑی کرنا۔ رکاوٹ بات بناتی نہیں بگاڑ دیتی ہے۔ شہہ دیتی ہے۔ بس دیکھتی جاؤ۔ یوں جیسے دیکھا ہی نہیں۔ جیسے دیکھنے کی کوئی بات ہی نہیں۔ سب اچھا۔۔۔ سب اچھا۔

اتنا اوور کانفی ڈنس بھی اچھا نہیں۔ ایک دن ایسا دھچکا لگے گا کہ سمجھ آ جائے گی۔۔۔ چلو مجھے کیا ہے میں نے ہر بات کی ذمہ داری تو نہیں لے رکھی۔ وہ جو کہتے ہیں سب مجھ پر چھوڑ دو تو ٹھیک ہے۔ جو ہو پڑا ہو۔ میں کیوں فکر میں گھلی جا رہی ہوں۔۔۔ خوانخواہ۔

آج وہ کاروالی پھر مل گئی۔ میں نے پہچان لیا۔

مجھے تو وہ یاد ہی نہ رہی تھی۔ ایسیاں تو کئی ملتی ہیں۔ روز کے روز۔ آج کل بڑا چاؤ ہے انہیں گاڑی چلانے کا۔ سڑک پر دس گاڑیاں گزریں تو چار چلانے والے ہوں گے۔ چھ چلانے والیاں۔ میں سٹاپ پر کھڑا تھا۔ وہ آئی ذرا رُکی۔ لڑکی ہو، کاروالی ہو، اکیلی ہو۔ رُکے۔ تو بات کرنے سے کون چُوکے۔ فدا پر تو عائد ہو جاتا ہے کہ کچھ کہے۔ سو میں نے کھڑکی میں منہ ڈالا اور سنجیدگی سے کہا۔ ہمیں بھی لے چلو۔ ساتھ بھرپور نگاہ ڈال دی تھی۔ بڑی تیکھی تھی۔ ایٹریکٹو۔ آج کل ساری ہی سمارٹ ہوتی ہیں۔ ایٹریکٹو ہوتی ہیں۔ لیکن اس نے تو حد کردی۔ ایسی غصے بھری نگاہ ڈالی جیسے بھڑ بھُن بھُن کررہا ہو۔ واہ۔۔۔ مزہ آ گیا۔

کریلا ہو تو ایسا نیم چڑھا ہو۔ کدو ٹینڈے تو بہت ہیں۔ جبھی یاد نہیں رہتے۔

ہاں تو وہ کاروالی آج پھر مل گئی۔ اتفاق سے میرے پاس مانگے کا موٹر سائیکل تھا۔ لگا دیا پیچھے۔ اتنے فاصلے پر کہ کار کے بیک ویو پر چہرا نظر آئے پھر بھرپور نگاہ جمائی۔ مسکراہٹ لشکائی۔ وہ رُک گئی۔ ہم بھی رُک گئے۔ کھڑکی میں منہ ڈال کر کہا۔ آپ کے مزاج اچھے

ہیں۔ اس نے تلوار نگاہ سے دیکھا بولی۔ پولیس کو رپورٹ کر دوں۔ میں نے کہا بصد شوق جو چاہیں کریں۔ بولی میں نے آپ کے موٹر سائیکل کا نمبر نوٹ کر لیا ہے۔ میں نے کہا نہ نہ نہ۔۔۔ یہ تو مانگے کا ہے اپنے پاس موٹر سائیکل کہاں۔ بولی آپ بیہودہ حرکتیں کیوں کرتے ہیں۔ میں نے کہا۔ دیکھنا تو بیہودہ حرکت نہیں۔ بولی جائیے کسی اور کو دیکھئے میں نے کہا۔ اور کوئی ہو بھی اس لائق۔ اس پر اس نے گاڑی چلا دی۔ ہم نے موٹر سائیکل چلا دی۔ اس نے پیچھا چھڑانے کے لیے بڑے چکر دیے۔ بڑے چکر دیے۔ پھر وہ ہار گئی۔ میں بھی اسے گھر پہنچا کر آیا اور ایسا سلوٹ مارا کہ مسکرا دی۔ اس کے پاس کار ہے تو اپنے پاس بھی ایک نگاہ ہے۔ اُوں ہُوں۔ کوئی مقصد نہیں تھا۔ آرٹ فار آرٹ سیک۔

اوہ۔ واٹ اے بوائے۔ بڑے گٹس ہیں۔ اور پھر تڑپ ہی تڑپ۔ خالی شوخی ہی نہیں۔ متبسّم شوخی۔ ذرا چیپ نہیں۔ اور حاضر جوابی ایسی کہ جواب نہیں۔ مجھے تو اس کی نگاہ کھا گئی۔ بھرپور نگاہ ڈالتا ہے تو جھن جھن چھڑ جاتی ہوں۔ اب تو روز ملتا ہے۔ روز جھنجھناتا ہے۔ بڑا بولتا ہے۔ بولے جاتا ہے، ہنسے جاتا ہے۔ لیکن کیا مجال کوئی ایسی ویسی بات کرے۔ نگاہ سے چھیڑ دیتا ہے۔ پھر دیر تک پھِروی رہتی ہوں۔

بس دو دن اور رہ گئے ہیں پھر اس کی چھٹی ختم ہو جائے گی تو لاہور چلا جائے گا۔ وہاں کلرک ہے بے چارہ۔ ماں ہے بہن ہے سارے گھر کا بوجھ سر پر پڑا ہے۔ پھر بھی خوش خوش۔ قہقہے شور شرابا۔ سوکھی زندگی کی لذت میں یوں لت پت ہے جیسے رس گُلّا شیرے میں پڑا ہو۔

لو وہی ہوا نا جس کا مجھے ڈر تھا۔ انجنا اس لڑکے کے پیچھے لاہور چلی گئی۔ جس روز سے وہ لاہور گیا تھا ڈانواں ڈول پھرتی تھی۔ بے چین تھی۔ میں نے انجنا کے ڈیڈی سے کہا بھی۔ میں نے کہا انجنا کی سُدھ بُدھ ماری گئی ہے۔ یہ ضرور اس کے پیچھے جائے گی۔ اجازت نہ دینا۔ لیکن میری بات کب مانتے ہیں۔ لڑکی نے ذرا سی ضد کی تو فٹ اجازت دے دی۔ بہانہ یہ کیا کہ میں نوکری کروں گی۔ یہاں نہیں لاہور۔ ایک تو اجازت دے دی دوسرے لاہور میں فلیٹ کا انتظام کر دیا۔ بولے تم آزاد ہو بیٹا بیشک لاہور میں نوکری کرو جب تک جی

چاہے کرو۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ ساتھ نوکرانی شادو کی بیٹی رضیہ کو بھیج دیا۔ میں نے بہت سمجھایا کہ ساتھ شادو کو بھیجئے وہ کم از کم خیال تو رکھے گی۔ لیکن میری کون سنتا ہے۔۔۔ بس لڑکی ہاتھ سے گئی اب وہ کہاں واپس آئے گی۔

آ۔ واٹ اے لائف۔ اسے کہتے ہیں زندگی۔ آئی ایم آن مائی اون۔ جاب ہے۔ فلیٹ ہے۔ نوکر ہے۔ اور سب سے بڑھ کر وہ ہے۔ فدا۔ وہ تو بالکل فدا ہو رہا ہے مجھ پر۔ میرے بغیر قرار نہیں آتا۔ کہتا ہے انجنا میں تو لٹ گیا۔ چاروں شانے چت۔ اب کیا ہوگا۔ یار میں تو مارا گیا۔ تم مخمل کی، مَیں ٹاٹ کا۔ تم کار والی میں پیدل۔ کہاں رانی انجنا کہاں گنگو تیلی۔ بھئی اپنا مستقبل اچھا نظر نہیں آتا۔ ذرا مجھے چٹکی بھرونا۔ دیکھوں سویا ہوں کہ جاگتا۔ بولتا جاتا ہے، بولتا جاتا ہے۔ ہنستا جاتا ہے۔ میری طرف بٹر بٹر تکتا جاتا ہے حتیٰ کہ آنکھیں ڈبڈبا جاتی ہیں واہ کیا ساتھی ہے کہتا ہے۔ نہ نہ انجی تُو تو مجھے بادلوں میں لے آئی اور اُوپر نہ لے جا۔ کہ میرے لیے گرنا مشکل ہو جائے۔ آخر تو گر کر ہڈی پسلی ٹوٹنی ہی ہے۔ ابھی سوچ لے نباہ سکے گی۔۔۔ میں نے بھی فیصلہ کر لیا ہے چاہے کچھ ہو جائے، ہم دونوں کبھی جدا نہ ہوں گے۔ میں تو کب سے اس کی ہو چکی ہوں۔ اسی کی رہوں گی۔ گھر والے زیادہ سے زیادہ عاق کر دیں گے نا۔ کر دیں۔ فدا سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں۔

پتہ نہیں لاہور سے کیوں نہیں آئے اب تک انجنا کے ڈیڈی۔ اب تک تو آ جانا چاہیے تھا۔ اللہ کرے خیر کی خبر لائیں۔

توبہ بڑی منتوں سے میں نے نہیں لاہور بھیجا۔ میں نے کہا لڑکی کو لاہور گئے چھ مہینے ہو گئے۔ جا کر اس کی خبر لیجئے۔ جواب میں کہتے چلو انجنا کچھ دیر اور پکنک منا لے۔ لو یہ کیا پکنک ہے۔ لڑکی ہاتھوں سے نکل گئی اور آپ اسے پکنک کہہ رہے ہیں۔ بولے پکنک ہی تو ہے۔ آ جائے گی، آ جائے گی۔ گھبراؤ نہیں مریم۔ اس گھر سے کوئی جا نہیں سکتا۔ یہ ہماری رِیت ہے۔ لو اب اس کا میں کیا جواب دوں۔

ہائیں۔ شاید دروازہ بجا ہے۔ کون ہے۔ اوہ آ گئے کیوں کیا خبر لائے انجنا سے ملے۔

نہیں۔ سیٹھ نے جواب دیا۔

تو گئے کس لیے تھے مریم نے پوچھا۔

کام سے گیا تھا۔

اور لڑکی کو ملے بغیر ہی آ گئے۔

میں اس لڑکے سے ملا تھا۔ اچھا لڑکا ہے۔ بات سمجھ گیا۔

کیا مطلب مریم بولی۔

لڑکے سے بات کی سب ٹھیک ہو گیا بے فکر رہو انجنا ایک ہفتے کے اندر اندر گھر آ جائے گی۔

خود سے آ جائے گی کیا۔

ہاں انجنا آئے گی تو خود سے آئے گی ورنہ نہیں آئے گی۔

لیکن کیسے مریم چلائی۔

لڑکے کو افسر گریڈ کی نوکری مل گئی ہے۔ بات طے ہو گئی ہے۔

مریم نے منہ میں انگلی ڈال لی۔

میں نے جو تمہیں کہا تھا۔ اس گھر سے اس ماحول سے کوئی نہیں جا سکتا مریم۔ یہ ہماری کمیونٹی کی ریت ہے۔ کوئی جائے بھی تو چند ماہ کی پکنک پر جائے گا۔ پھر از خود واپس آ جائے گا۔ از خود۔ اس گھر کا جادو اٹل ہے۔

مریم۔ یہ سیٹھ کا گھر ہے۔ فکر نہ کرو تم مریم سب ٹھیک ہو جائے گا۔

چھ مہینے کی پکنک سے کیا فرق پڑتا ہے۔

یہ پکنک تھی کیا، مریم غصے میں چلائی۔

تم بھی تو شادی سے پہلے پکنک پر گئی تھی۔ مریم بھول گئی کیا۔

مریم نے منہ میں انگلی ڈال لی۔ نگاہیں جھکا لیں۔ آپ کو پتہ تھا کیا۔

سیٹھ نے سر ہلا دیا۔ ہاں پتہ تھا۔ اب چائے تو منگواؤ مریم ڈارلنگ۔

-☆-

باجوؤں کی ڈھونڈ

پتہ نہیں کیا ہوگیا ہے مجھے۔ کچھ ہوگیا ہے۔ نجر دھندلا گئی ہے۔ جاگتے ماں سپنے دِکھیں ہیں۔ دل کو دھڑکن لگ گئی ہے۔ ڈاکدار کہے ہے دل ماں کانٹا لگ گیا ہے۔ لواس عمر ماں بھلا کیسے لگے گا کانٹا اور پھر اس گھر ماں۔ یہاں تو آرام ہی آرام ہے۔ یوں پڑا ہوں جیسے سونے کی مُندری مکھمل کی ڈبی ماں پڑی ہووے ہے۔

یہ کمرہ جہاں رہتا ہوں ماں انڈے کی طرحیوں چمکے ہے۔ نیچے گلیچہ بچھا ہے۔ اتنی صفائی ہے کہ کھلتی ہے۔ ایمان سے۔ کھانساماں وخت پر روٹی لاوے ہے۔ وخت پر نشتہ، وخت پر چاہ، وخت پر دُودھ۔ نہ نہ ڈیننگ رُم ماں جانا نہیں پڑے ہے۔

شیدے نے پہلے روج ہی کھانساماں سے بول دیا تھا۔ دیکھو کھانساماں بڑے چودھری صیب کا نشتہ، لنچ اُدھر لگے گا بڑے صیب کے کمرے ماں اور ڈیننگ روم میں لگنے سے آدھ گھنٹہ پہلے لگے گا۔ بعد ماں نہیں، ساتھ نہیں۔ پہلے۔ سمجھے۔

شیدا بڑا کھیال رکھے ہے روج آوے ہے اک وار اس کمرے ماں۔ پُچھن کے لیے بہووی کدی کدی آجاوے ہے نجر آتے جاتے بڑی اچھی ہے۔ سلام کرے ہے۔ پُچھے ہے بابا اچھے ہیں آپ، مُسکا کے بات کرے ہے پر چلتے چلتے۔

آج کل رواج ہی ایسا ہے۔ بہوویں رُکتی نہیں بچاری کیا کریں۔ رُکنے کا ٹیم نہیں ہوتا اندر اتنی جان ہوتی ہے کہ رُکنے نہیں دیتی۔ ہمارے جمانے ماں بھی جان ہوا کرے تھی۔ گھر والی ماں بڑی بڑی جان ہوتی تھی۔ پر وہ ٹھنڈی جان ہووے تھی۔ اب تو تتی ہووے ہے۔ بڑی تتی۔ اتنی تتی کہ بھڑاس نکلے ہے پہلے بھی بھڑاس ہووے تھی۔ پر وے نکلے نہیں تھی۔ جلی

پاتھی کی طرجیوں اوپر سے کالی سوا۔ نیچے لال انگارہ۔ اب تو لال انگارہ اُوپر ہووے ہے۔ وخت وخت کی بات ہے بھائی کدی مال بھیتر چُھپا کر رکھیں ہیں۔ کدی باہر سجا کر رکھیں ہیں۔

سارا دن ماں اپنے اپنے بجے کمرے ماں آرام سے پڑا رہوں ہوں۔ بس ایک تخلیف ہے۔ اسمان نہیں دکھتا بچپنے سے اک عادت پڑی وی ہے کہ اسمان دکھتا رہے جو اسمان دکھتا رہے تو حوصلہ رہے ہے پتہ نہیں کیوں۔ ایک تو دل تنگ نہیں ہووے ہے دوجے جندگانی بند بند نہیں لگے ہے۔ پھر یہ بھی کہ اسمان دکھے ہے تو اسمان والا بھی دُور نہیں لگے ہے۔ جیسے نیڑے نیڑے ہو۔ پاس ہو، ساتھ ہو۔ اک تسلی سی رہے ہے۔ جندگی میں کیا چیئے۔ بس اک تسلی۔ اور کیا۔

اس کمرے ماں اسمان نہیں دکھے ہے۔ بس یہی اک تخلیف ہے۔ بڑی تخلیف ہے پھر دروجے ہیں۔ ساری عمر کھلے دروجوں ماں بتائی؛ پر اس کمرے کے دروجے بند ہی رہیں ہیں، کھلتے تو ہیں پر کھل کے نہیں دیتے۔ پھٹ سے بند ہو جائیں ہیں، آپ ہی آپ پھر دروجوں پر پردے پڑے رہیں ہیں۔ یہ سیسے کا ہے یہ جالی کا یہ گرل کا یہ کپڑے کا۔ پردے ہی پردے، پردے ہی پردے۔ بھلا اسمان کیسے نجر آئے۔ بس جمین ہی جمین دِکھے ہے وہ بھی بنی بجی گلیچے والی۔ مٹی والی دھرتی نہیں دِکھتی، بوٹے نہیں دکھتے۔ ویسے بوٹے تو بہت ہیں بنگلے ماں۔ وہ بھی طرحاں طرحاں کے۔ پر بھی بناوٹی۔ گملوں والے۔ دھرتی والے نہیں۔

چلو اسمان نہیں دِکھتا تو نہ سہی اتنی سی بات سے کانٹا تو نہیں لگتا نا دل ماں۔ پھر ڈاکدار کیوں کہے ہے کانٹا لگ گیا ہے۔ بھیا، کانٹا تو دُکھ میں لگے ہے سُکھ ماں تو نہیں لگے ماں تو یہاں سُکھ میں پڑا ہوں۔ سمجھ کرلو جس طرجیوں گری بدام میں پڑی ہووے ہے۔ پھر کانٹا کیسا۔

ہاں ایک بات جرور ہے۔ نجر دھندلا گئی ہے۔ منے یہ بات ڈاکدار کو نہیں بتائی۔ جو بتا دیتا تو وہ پچھتا پتہ نہیں کیا کیا پچھتا۔ ویسے بھی ماں باجوؤں کی بات جو بتا بھی دیتا تو کیا وہ سمجھ لیتا۔ ماں تو کھد نہیں سمجھ پایا باجوؤں کی بات کو۔ پھر بھلا وسے کیسے سمجھاتا۔ منے تو اپنے پتر شیدے سے نہیں کری یہ بات۔ بھلا بتاؤ جس کا نہ سر ہو نہ پیر وے کون سمجھائے۔ کون سمجھے۔

اور کوئی سمجھے بھی کیسے باجوؤں کی بات۔ باجوؤں کا تو جمانہ ہی نہیں رہا۔ وہ تو کد سے کھتم ہو گیا۔ اب تو باجوؤں نے روپ ہی بدل لیا ہے۔ وہ تو گلے کا ہار بنے وے ہیں۔ اب وہ پرانے جمانے کے باجو کہاں۔ اب تو کھالی جسم رہ گیا ہے۔ تیکھا۔ تڑاوا۔ یوں جیسے تیر کمان پر چڑھا ہو۔ اب چھوٹا کہ اب چھوٹا۔۔۔

یہ جب اور اب کا جھگڑا سدا کا ہے بھائی۔ ہمیش جب جب رہا اور اب اب۔ نہ کدی جب اب ہوا، نہ اب جب۔ دونوں ماں پھاصلا اِی رہا۔ اب تو یہ پھاصلا روج بروج بڑھتا ہی جاوے ہے۔ دناں ماں صدیاں کا پھرق پڑتا جاوے ہے۔

ہاں تو نجر کی بات کر ریا تھا ماں۔ اپنی نجر دھندلائے کچھ جیادہ دیر بھی نہیں ہوئی یہی چار ایک بیتے ہوئے ہوں گے۔ نہیں بھئی دکھنے ماں تو پھرق نہیں آیا۔ سب کچھ دکھے ہے۔ ٹھیک ٹھاک دکھے ہے۔ کمرے کی تانکیاں دکھیں ہیں۔ دروجے دکھیں ہیں پردے دکھے ہیں۔ کونچ دکھے ہے۔ میج دکھے ہے۔ سب چیجیں دکھیں ہیں۔ صاف دکھیں ہیں۔ کوئی چیج نہیں دھندلائی۔ صرپھ نجر دھندلائی ہے۔ یوں کہ کھوامکھواہ کی چیجیں دکھنے لگی ہیں۔ وہ بھی بُہتی نہیں۔ صرپھ دو باجو۔ دو باجو میرے کمرے ماں گھس آئے ہیں۔ وہ میرے آسے پاسے یوں گھومیں پھریں ہیں جیسے سربت کی بوتل کے گرد مکھیاں۔

پہلے دنا جد مینے باجوؤں کو دیکھا تو ماں تو گھبرا گیا۔ ایمان سے رات کا وخت تھا۔ بشیرا کھانسا ماں آیا۔ وسنے روٹی میج پر رکھ دی۔ اس وخت کھانے کو جی نہیں چاہے تھا۔ منے سوچا چلو کھالو چودھری فضلے دو برکیاں پھر ارام سے حقہ پیوں گا۔

حقہ مجھے بہت پیارا ہے۔ سمجھ کر لو یہی اک ساتھی رہ گیا ہے پُرانے دناں کا۔ میرے پاس بیٹھ کر رات گے تو ڑی مجھ سے باتاں کرتا رہے ہے۔ اپنی کہے ہے میری سنے ہے۔ گھر ماں کسی کو میرا حقہ پسند نہیں کھانساماں اسے ہاتھ نہیں لگائے ہے۔ ماں کُھد ہی تاجا کروں ہوں کھد ہی چلم بھروں ہوں۔ بہو تو کہے۔ ہے۔ ہئے بو، بو، بو۔ لے جاؤ، اسے یہاں سے مجھے نجر نہ آئے۔ شیدے نے منہ کھول کر کدی نہیں کہا کچھ۔ آنے بہانے بہت کچھ کہا کہنے لگا بابا سگرٹ کا بڑا ڈبہ منگوادوں کدی حقہ نہ بھرا سگرٹ پی لیا۔ اک روج وہ لے بھی آیا بڑا ڈبہ

جس ماں ڈبیاں تھیں میرے کمرے میں چھوڑ گیا وے۔ مہینہ بھر پڑا رہا یہاں جوں کا توں بند کا بند۔ منے منہ نہ لگایا۔ کیسے لگاتا۔ بھائی کہاں گونگا چرٹ، کہاں باتاں کرنے والا حقہ۔ ماں اپنے دکھ سکھ کے ساتھی کو کیسے چھوڑ دیتا بھلا۔ ایک ہی تو ساتھی ہے اپنا اس بھرے گھر ماں۔

ہاں تو میں اس روج کی بات کر رہا تھا۔ منے سوچا چودھری فضلے کھا لے دو بُرکیاں پھر آرام سے بیٹھ کر حقہ پیئیں گے۔ لو جی ماں میج پر جا بیٹھا۔ روٹی والا رمال کھولیا پتہ نہیں دو باجو کہاں سے تیرتے وے آئے۔ اک باجو کا ہتھ کھلا اور وس نے پلیٹاں سے روٹی اٹھا کر میرے ہتھ ماں تھما دی۔ ماں تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ حریان۔ پھر وہ باجو میرے آسے پاسے ہی رہے۔ بوٹی کھانے لگا تو دو انگلیوں سے پکڑ کر سامنے رکھ دی۔ پانی پینے لگا تو گلاس ہتھ ماں پکڑا دیا۔ ماں تو حریان۔ یا اللہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

بس اس روج سے آج تو ڑی یہی ہو رہا ہے۔ دن رات اندھیرے سویرے۔ سر بھارا بھارا ہو تو انگلیاں پڑپڑیاں سہلا دیں ہیں۔ تھکاوٹ ہو تو ہاتھ پنڈلیاں دبا دیں ہیں۔ اُٹھتا ہوں تو باجو سہارا دیویں ہیں۔ کھاٹ سے اٹھوں تو جوتا سامنے رکھ دیویں ہیں درجہ کھولیں ہیں۔ قدم قدم پر سنبھالا دیویں ہیں۔

پہلے تو ماں سمجھیا سٹھیا گیا ہوں۔ جہن گڈمڈ ہو گیا ہے نجر تماسے کھیل رہی ہے پھر سوچ سوچ کر ماں نے کہا چودھری فضلے یو بات نہیں نہ تو جہن دھندلایا ہے نہ نجر یہ کچھ اور ہی بات ہے۔ سوچتا رہا دیکھتا رہا دیکھتا رہا۔ باجو چٹے نہیں گورے نہیں بدامی ہیں۔ بھرے بھرے۔ سوکھے نہیں۔ بنے سجے نہیں جیسے آج کل ہو ویں ہیں نہ رنگ دار نہ ریسمیں نہ ملیم۔ پر ہیں صاف ستھرے۔ درسی نہیں کامی ہیں۔ انگلیاں یہ موٹی موٹی ہیں۔ بھنڈیوں کی طرحیوں نہیں۔ نہ کولیاں تہ پتلی پتنگ، نخون بڑھے وے نہیں چھریوں کی طرحیوں۔ کٹے وے ہیں۔ رنگ دار نہیں سادہ مرادے ہیں۔ یو باجو آج کل کے باجو نہیں۔ چھیڑتے نہیں سنبھالتے ہیں۔ ڈولتے نہیں سہارا دیویں ہیں۔ دکھنے والے نہیں کامی ہیں۔ تو بھائی ماں دیکھتا رہا دیکھتا رہا۔

کدی کدی لگتا جیسے جانے پچھانے ہوں۔ ویکھن ماں نئے پر، ورتن ماں جانے پچھانے میرے آسے پاسے ہواماں تیریں ہیں تو ان جانے دِکھیں ہیں۔ سر دباویں ہیں۔ سہارا دیویں ہیں تو جانے لگیں ہیں۔

پھر اک دنا بھید کھل گیا۔

میری نجر باجو کی کُنی پر جا پڑی۔ پھوڑے کا اتنا بڑا نسان۔۔ ارے یو تو سگو کے باجو ہیں۔

پھر ماں سوچن لگا۔ چودھری فضلے یہ جو تجھے دن رات سگو کے باجو کھنے لگے ہیں۔ کیا تجھے وس سے موحوبت تو نہیں ہوگئی۔۔۔ پھر ماں کھد ہی ہنس پڑا۔ یہ موحوبت کی بات بھی ایک رہی۔ چودھری فضلے جندگی کے تیہہ ورے تو نے سگو کے ساتھ گجار دیے۔ تیہہ ورے، پر تجھے وس سے موحوبت نہ ہوئی اور اب جدا سے مرے وے پنج ورے ہو گئے ہیں اب کیا تجھے وس سے موحوبت ہوگئی ہے۔ اس پر ماں اتنا ہنسا اتنا ہنسا کہ آنکھوں ماں آنسو آ گئے۔

اور پھر سگو سے موحوبت۔ سگو سے کیسے موحوبت ہو سکے ہے بھلا۔ سگو تو باجو ہی باجو تھی۔ خالی باجوؤں سے کون موحوبت کر سکے ہے بھلا۔ اس اللہ کی بندی نے نہ کدی منہ کی ٹکڑی سجائی نہ لشکائی نہ ہی سامنے دھری۔ منے بھی کدی منہ کی طرپھ دھیان نہ دیا۔

ویسے سگو کا منہ بھی تھا، متھا بھی تھا اور جو بنا تو بڑے جور کا تھا۔ تیکھا۔ کانٹے کی طرحیوں چبھنے والا۔ چھیل دیوے تھا۔ پر وِسنے اسے موٹی چدر ماں ہی لپیٹے رکھا۔ ہمیش یوں جیسے چوری کی چیج ہو۔ وسنے تو سب کچھ ہی لپیٹے رکھا۔ سب کچھ۔ بس اک باجو ہی کھلے چھوڑ رکھے تھے۔

سارا گھر وسکے باجوؤں سے بھرا رہے تھا۔ ادھر وہ کپڑے دھو رہے ہیں ادھر بھانڈے مانج رہے ہیں پھر دیکھو تو جلتے تنور میں لٹکے وے ہیں۔ چاٹی کے گرد گھوم رہے ہیں۔ آٹا گوندھ رہے ہیں۔ بلونی سے چمٹے وے ہیں۔ مجھ دوہ رہے ہیں گتادا کر رہے ہیں۔ سجی بنا رہے ہیں۔ ماں کھیت ماں بیٹھا روٹی کھا ریا ہوں وے پنکھا کر رہے ہیں۔ ماں حقہ پی ریا ہوں وے ٹوپی ماں تاجہ انگارے رکھ رہے ہیں۔ ماں تھک گیا ہوں وے مٹھیاں بھر رہے

ہیں۔

تیہہ ورے میرا گھر ان باجوؤں سے بھرا رہا۔ اور صرپھ گھر ہی نہیں میرے کھیت ماں بھی وہ بوٹوں کی طرحیوں لہلہاتے رہے۔

سگو ماں جنانی بھی تھی یو نہیں کہ کھالی باہاں ای باہاں تھیں۔ یوں سمجھ کرلو کہ وہ آلو کا بوٹا تھی۔

جنانی بھیتر تھی۔ باہر باہیں لہلہائیں تھیں۔ آج کل کی جنانی تو دھنیا ہووے ہے سب باہر ہی باہر۔ اور پھر دُور دُور تک مشک مارے ہے۔ وخت وخت کی بات ہے بھائی۔ کدی مُشک لکونے کا جمانہ، کدی مُشک مارنے کا۔

کدی کدی سگو کی جنانی بولا بھی کرے تھی۔ اکھ سے اکھ ملا کر نہیں۔ جھکی نجر سے چلتے چلتے۔ کہتی رے بہت بھارا ہو گیا ہے میرا پنڈا اسے ہولا کر دے۔

کدی کدی کہے تھے یو بات۔ دو چار مہینوں ماں اک ادھ واری۔ کدی ماں کہہ دیتا ہنس کر۔ ری تو تو بھاری ہور ہی دکھے ہے اور وہ مسکار کر نجر نیچی کر لیتی۔

ہمارے وہ پہلے پہل کے دن بڑے کٹھن تھے ماں بھی لُٹا پٹا اکیلا پلاں والے پہنچا تھا۔ وہ بھی روئی روئی رلی وی بے سہارا پتہ نہیں کہاں سے آئی تھی تقدیر نے جوڑ ملا دیا۔ گاؤں کے چودھری نے تھوڑی سی جمین دے دی، اک ٹوٹا پھوٹا گھر دے دیا پھر ماں ہل پر جُت گیا۔ وس نے باجو نکال لیئے۔ جتنی ویہڑے کی دھریک نے ٹہنیاں نکالیں وتنی سگو نے باہیں نکالیں۔ دھریک نے ویہڑے پر چھاؤں کر دی گھر میں سگو کے باجوؤں نے لہر بہر کر دی۔ کھیت ماں پیدا بڑھی تو مُجھ لے لی گھر ماں دودھ دہی کی دھاراں چلنے لگیں۔ وسنے صرپھ ایک پتر دیا شیدا۔ وہ بھی اتنا لیق فیق کہ جس مدرسے ماں گیا وجیفہ لیا۔ ماشٹر نے کہا چودھری تیرا پُتر بڑا صیب بنے گا۔ سو بن گیا۔

پھر بھی وہ پہلے پہل کے دن بہت کٹھن تھے۔ جو سگو کے باجو پتوار نہ بنتے تو ناؤ ڈولتی ہی رہتی پار نہ لگتی۔ بڑی اُونچ نیچ دیکھی اِن دِناں۔ بڑی جوراجوری کرنی پڑی۔ پر اب ماں سوچوں ہوں کہ مسکل کے دِن ارام کے دناں سے اچھے ہووے ہیں۔ اونچ نیچ کی لہریں چلتی

رہیں تو جندگی ماں حرکت برکت رہے ہے۔ کھالی ارام تو لوہے کو بھی جنگ لگا دے ہے۔

ان دناں جد ماں سام کے وخت اسمان تلے بیٹھ کر حقہ پیتے وے کھیت کو دیکھتا تو جی کھُش ہو جاتا۔ گھر کو تو سگو کے باجوؤں نے میرے لیے تخت بنا رکھا تھا۔ اور میری پگڑی پر طرّہ لہرا رکھا تھا۔ اتنی عجت تھی گاؤں ماں۔

کدی کدی اسمان تلے بیٹھے وے اوپر سے اک اواج سی آتی۔ چودھری فضلے کچھ اور چیئے تو مانگ لے اور ماں ہنستا۔ کیوں مکھول کرے ہے رے۔ باجوؤں کے تخت پر بٹھا دیا۔ پگ پر طرہ لہرا دیا۔ پتر کو بڑا صیب بنا دیا۔ اب اور کیا مانگوں۔

پھر ایک دنا بیٹھے بٹھائے سگو پھوت ہو گئی۔ کلیجے ماں پیڑ اُٹھی۔ باہیں اُٹھا کر بولی رے پکڑ لے رے مجھے۔ پہلی بار دونوں باجو میرے گلے میں ڈال دیئے کھلے بندوں۔ پھر ایک ہچکی لی اور ٹھنڈی ہو گئی۔

پھر شیدا گاؤں آیا ماں کو وہیں پلاں والے ماں دفنا دیا اور مجھے جبر دستی ادھر لے آیا۔ اپنے بنگلے ماں۔

ہائیں یہ دروجہ کیوں بجا۔ کون ہے رے دروجے پر۔

میں ہوں بڑے چودھری جی بشیرا۔ خانساماں نے جواب دیا۔

تو اندر آ جانا۔۔۔ بول کیا بات ہے۔

صاحب کا فون آیا ہے جی دفتر سے۔ بشیرے نے جواب دیا۔

کیا کہے ہے وہ تیرا صیب۔

صاحب کہتے ہیں بڑے چودھری صاحب سے بولو کہ تیار ہو جائیں۔ بستر باندھ لیں سوٹ کیس میں کپڑے رکھ لیں۔ ابھی ابھی صاحب کے ساتھ گاڑی میں جانا ہے۔

کہاں جانا ہے رے۔ چودھری فضلے نے پوچھا۔

جی پلاں والے جانا ہے۔

پلاں والے۔

جی صاحب بولتے ہیں شاید وہاں ایک دو مہینے رہنا پڑے اس لیے مالی رحیماں ساتھ

جائے گا۔

پر کس لیے۔ یہ بھی تو بتانا۔

پلاں والے سے خبر آئی ہے کہ وہاں سیلاب آیا تھا چودھرانی کی قبر بہہ گئی ہے میت باہر نکل آئی ہے۔

ہائیں میت باہر نکل آئی ہے۔

میت کے دونوں بازو کٹ کر بہہ گئے ہیں۔ ان کی ڈھونڈ کرنی ہوگی۔ قبر پھر سے بنوانی پڑے گی۔

باجوؤں کی ڈھونڈ کرنی ہوگی چودھری نے دُہرایا پر باجو تو۔۔۔ چودھری نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا پھر دفعتاً وہ یوں چپ ہوگیا جیسے کسی نے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔

-☆-

کُھل بندھنا

مندر کے احاطے سے گزرتے ہوئے سیوا کارن، بانورے کو بڑ کے درخت تلے بیٹھا دیکھ کر رُک گئی۔ بولی ارے تجھے کیا ہوا۔ جو یوں ہانپ رہا ہے تُو۔

بانورے نے ماتھے سے پسینہ پونچھا۔ بولا سیوا کارن سامان اٹھاتے ہار گیا۔

کیسا سامان رے۔ سیوا کارن نے پوچھا۔

اب کی پورن ماشی میں اتنی ساری چاتریاں آئی ہیں کہ حد نہیں۔

چالیس سے اُوپر ہوں گی۔ ان کا سامان۔

چالیس سے اُوپر۔ سیوا کارن نے حیرانگی سے دہرایا۔

ہاں دیوی وہ بولا۔ سب کچی عمر کی ہیں۔ لڑکیاں ہی لڑکیاں۔ پکی عمر کی بس چار ایک ہوں گی۔ پر وہ بھی لڑکی سمان دِکھتی ہیں۔ مجھے تو یوں لگے ہے جیسے سارا کالج ہی اِدھر آ گیا ہو۔

یہ سن کر سیوا کارن سوچ میں پڑ گئی۔ جیسے چُپ لگ گئی ہو۔ پھر بولی تپسنی مہامان کا کہنا سچ ہو رہا ہے۔ وہ کہا کرتی تھی۔ سیوا کارن کلجگ میں نہ استری رہے گی نہ ناری۔ صرف لڑکیاں رہ جائیں گی، ابلائیں۔ پھر ممتا کا دھارا سوکھ جائے گا۔ ناتے ٹوٹ جائیں گے۔ پُرش اور ناری کا فرق مٹ جائے گا۔ ایک کو دوسرے سے پرکھنا مشکل ہو جائے گا۔

ہاں یہ تو ہو رہا ہے۔ بانورے نے دبی زبان سے کہا پر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آوے ہے وہ کیا۔ سیوا کارن نے پوچھا۔

وہ یہ کہ ایک دم سے دیوی کُھل بندھنا کی لگن کیسے لگ گئی۔ یہ کالج والیوں کو کیا ہوا کہ

دیوی کے چرن چھونے آ گئیں۔ انہیں نہ تو دیوی پر وشواس ہے نہ دیوتا پر۔ پورن ماشی پر بس پانچ چھ آ جایا کرتی تھیں۔ اب کے چالیس کیسے آ گئیں۔ ہے بھگوان یہ کیا بھید ہے۔

سیوا کارن مسکرائی بولی بھگوان کے بھیدوں کو کس نے جانا ہے بانورے۔

سیوا کارن جانے لگی تو مائی بھاگی دوڑی آئی بولی دیوی کے جاتری بہتے ہیں اور مندر کی کوٹھڑیاں کم۔ انہیں کیسے ٹھکانہ دوں۔

جیسے کیسے پورن کر دے بھاگی۔ سیوا کارن نے جواب دیا۔ بس ایک بات کا دھیان رکھیو کہ مندر میں کوئی نہ سوئے اور تپسنی مہامان کی کوٹھڑی میں کوئی پاؤں نہ دھرے۔

وہاں کون پاؤں دھر سکتا ہے بھلا۔ بانورہ بولا۔ مہامان کی کوٹھڑی تو سدا بند رہتی ہے۔ اندر سے کنڈی لگی رہتی ہے۔

سیوا کارن پھر سوچ میں پڑ گئی۔۔۔ اسے چپ لگ گئی دیر تک مائی بھاگی اس کا منہ تکتی رہی۔ پھر سیوا کارن گویا اپنے آپ سے بولی ہاں کنڈی کا بھید نہ جانے کب تک رہے گا۔ جیون بھر تپسنی مہامان نے اندر سے کنڈی لگائے رکھی۔ پھر جب مرن بعد اس کی ارتھی اٹھانے گئے تو دیکھا کہ پھر اندر سے کنڈی لگی ہوئی ہے۔

کیا کہا مرن کے بعد اندر سے کنڈی کس نے لگائی۔ بانورہ بولا۔

کون جانے۔ سیوا کارن نے مدہم آواز میں خود سے کہا۔ گرو دیو کا کہنا ہے کہ تپسنی مہامان کے مرن جیون کا بھید آج تک نہیں کھلا۔

ہے بھگوان۔ بھاگی نے ہاتھ جوڑ کر ماتھے پر رکھ لیے۔

سیوا کارن نے کہا پرنتو جوتش والوں کا کہنا ہے کہ کلجگ میں کسی پورن ماشی کو یہ بھید ضرور کھلے گا۔ کھل کر رہے گا۔ گرو دیو کہتے ہیں۔ ہاں مہامان کے ابھاگ کا چکر اک دن ضرور ٹوٹے گا پھر اسے شانتی مل جائے گی۔

سچ ہے سیوا کارن جی۔ بھاگی بولی۔ اب بھی کئی بار آدھی رات کے سمے مندر سے مہامان کے بھجن کی آواز آتی ہے۔

کھل بندھنا۔ بندھ دے۔ کھل بندھنا۔

ہائیں یہ کیسے بول ہیں۔ بانورہ بولا جو دیوی بندھن کھولے ہے۔ اس کے چرنوں میں بیٹھ کر بندھ دے کی پرارتھنا کرنا۔ ہرے رام، ہرے رام، ہرے رام۔

سیوا کارن کو پھر چپ لگ گئی۔

اس وقت سورج مغرب میں یوں غروب ہو رہا تھا جیسے مندر پر رنگ پچکاریاں چلا رہا ہو۔

مندر کے پرلے سرے پر گھنے بوہڑ کے درخت کے لمبے سائے میں بیٹھا شام مراری بانسری پر کلیان بجا رہا تھا۔ بادلوں میں آگ لگی ہوئی تھی دُور ان پورنا کے گاؤں میں کوئی چکی کراہ کراہ کر تال دے رہی تھی۔

عین اس سمے مندر سے کھڑ کھڑ ہنسی کی آواز سنائی دی۔

وہ سب چونک اٹھے ہائیں یہ کیا۔

یہ کیسی آواز ہے۔ سیوا کارن نے پوچھا۔

یہ چاتری ہیں۔ دیوی بھاگی بولی۔ دیوی کھُل بندھنا کے چرنوں میں بیٹھ کر گیان دھیان کی بجائے ہنس بول رہی ہیں۔

بانورہ ہنسا کہنے لگا ان آج کل کی چھوکریوں کو کیا پتہ کہ دیوی کیا ہووے ہے بندھن کیا ہووے ہے۔ جیون کیا ہووے ہے۔

مندر سے ہنسی کا ایک اور ریلا اُٹھا۔

کانتا کا منہ غصے سے لال ہو رہا تھا۔ بولی یہ ہنسنے کی بات نہیں رونے کی ہے۔ یہ سارے شبد دیوی، رانی، استری، شریمتی، عورت وومن سب جھوٹے ہیں۔

تو پھر سچا لفظ کون سا ہے۔ کوشلیا نے پوچھا۔

کانتا بولی میری طرف دیکھو۔ میں نہ دیوی ہوں، نہ شریمتی ہوں، نہ وومن ہوں۔ میں اک باندی ہوں اے سلیو صرف میں ہی نہیں تم ہم سب وی آر آل سلیوز۔ سلیوز!

سچ کہتی ہے کنول بولی۔ ہم سب اپنے ماسٹر کا دل خوش کرنے کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ ہم اپنے مالکوں کو خوش وقتی دیتی ہیں۔ اے موومنٹ آف جائے۔ اے موومنٹ آف

اکسائٹمنٹ۔ ایک لذت کا لمحہ۔ وقتی چٹخارہ اور بس۔

نہ ابلا ایسا نہ کہو، دیہاتن بولی۔ ناری داسی نہیں مالکن ہوتی ہے۔

کھی کھی کھی کھی۔ کنول تمسخر سے ہنسی۔

مجھے بتا تو وہ کون عورت ہے جو داسی نہیں بلکہ مالکن ہے۔ کانتا نے پوچھا۔

مَیں ہُوں مَیں، دیہاتن نے فخر سے سر اُٹھا کر کہا۔ میں اپنے پتی کے من پر راج کرتی ہوں مسکا کر دیکھوں تو وہ لہلہا اٹھتے ہیں۔ گھوری دکھاؤں تو مرجھا کر گر پڑے ہے سوکھ جائے ہے۔

جو ایسا ہے کانتا نے غصے میں کہا ''تو تُو کھل بندھنا دیوی کی پورن ماشی میں جھک مارنے آئی ہے کیا؟

یہاں تو بندھن کھلوانے آتے ہیں۔ کوشلیا نے وضاحت کی۔ تو کون سا بندھن کھلوانے آئی ہے۔

سچ کہو ہو ابلا، سچ کہو ہو۔ دیہاتن نے جواب دیا۔ میرے بھاگیہ کی گانٹھ پتی کے من میں نہیں پڑی۔ ساس کے من میں پڑی ہے۔ وہ ہمیں دیکھ نہیں سکھاوے ہے جتنا پتی چاہے ہے اتنا ہی ساس جلے ہے۔ وِس گھولے ہے۔ اپنے پُتر کو مجھے راسن کر کے دیوے ہے۔

اُدھر وہ تڑپے ہے ادھر میں تڑپوں ہوں۔ بیچ میں ساس دیوار بن کر کھڑی رہے ہے بس یہی میرے نصیبے کا بندھن ہے۔ کیا پتہ اس پورن ماشی میں دیوی کھل بندھنا میرا یہ بندھن کھول دے۔ وہ ہاتھ باندھ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ جے ہو دیوی کھل بندھنا کی۔

کھی کھی کھی۔ کنول ہنسی۔ بھولی عورت یہ جو ساس نند ہیں یہ تو پتی کے ویہڑے کے چاند ہیں۔ ان کی اپنی روشنی نہیں۔ مانگے کی ہے۔ پتی مہاراج کی دین ہے۔ سارا چمتکار سورج مہاراج کا ہے۔ چاہے تو ساس کا چاند چمکا کر بہو کے سر پر لٹکا دے۔ چاہے تو نند کا ہانڈا جلا کر بھاوج کی آنکھیں چندھیا دے۔

سچ کہتی ہو۔ سُندری بولی۔ سب کھیل مداری کا ہے۔ چاہے تو بندریا نچاوے چاہے تو مینا سے ٹیں ٹیں کراوے۔

کانتا سنجیدہ ہو کر بولی۔ پگلی ساس نند تو پُتلیاں ہیں۔ پتی دیو کے ہاتھ میں ڈوری ہے جسے چاہے نچا دے۔ بچارے مات پِتا کا کیا دوش۔

مات پِتا سیتے کے ماتھے پر گھوری تن گئی۔ سکھیو عورت کا کوئی بھی اپنا نہیں، نہ بھائی بہن نہ مات پتا۔ یہ وہ ناؤ ہے جس کا کوئی پتوار نہیں۔ بس ڈولن ہی ڈولن ہے جیون بھر کا ڈولن۔ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پھر ایک ہچکی نے اس کی بات کاٹ دی۔

تیری بپتا کیا ہے ری۔ سُندری نے پوچھا۔

مت پوچھ۔ شکنتلے چیخی۔ دُکھیا کو نہ چھیڑ۔ پھوڑے کو ہاتھ نہ لگا۔

میری بپتا۔ سیتے گنگنائی۔ میں اک بکاؤ مال ہوں۔ مات پتا مجھے دو بار بیچ چکے اب تیجی بار کے داؤ میں بیٹھے ہیں۔ پہلے بیچتے ہیں۔ پھر بسنے نہیں دیتے کہ پھر سے بیچ سکیں۔

سیتے اُٹھ بیٹھی۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر دیوی کی مورتی کے سامنے کھڑی ہو گئی بولی ہے کھل بندھنا دیوی۔ بتا۔ کیا میرے بھاگیہ میں بکنا ہی لکھا ہے۔ بول جو ایسا ہی ہے تو بتا کہ میں خود اپنے کو بیچوں۔ کھلے بندوں بیچوں۔ روج کے روج بیچوں۔ مجھے یہ دُکھ تو نہ رہے کہ مات پتا اپنی پیٹ جائی کو بکاؤ مال بنائے بیٹھے ہیں۔

کنول اُٹھی اس نے سیتے کو کلاوے میں بھر لیا۔ بولی جی بُرا نہ کر بہنا۔ اک تُو ہی نہیں۔ ہم سب بکاؤ مال ہیں۔ کوئی خود کو اک ہی مرد کے ہاتھ روز کے روز بیچتی ہے۔ کوئی رنگ رنگ کے پُرش کے ہاتھ بکتی ہے۔

کیا فرق پڑتا ہے کانتا نے کہا۔ ایک کے ہاتھ بار بار بکو یا ہر رات نئے گاہک کے ہاتھ بکو بکنا ہمارا بھاگیہ ہے۔ کتنا بڑا بندھن ہے۔

صرف ایک نہیں۔ بندھن ہی بندھن ہیں۔ کنول غصے میں چلّائی۔

اُٹھو بہنا سب بندھن توڑ دو۔ اپنی ہمت سے توڑو۔ شکنتلے چلّائی۔ ایک بھی باقی نہ رہے۔ یہ پتھر کی دیوی کھل بندھنا بے چاری کیا کرے گی۔

ہوش کرو لڑکیو۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ مائی بھاگی بات کئے بغیر نہ رہ سکی۔ مندر میں کھل بندھنا کے چرنوں میں بیٹھ کر تم پورن ماشی سے ایک رات پہلے دیوی کے کھِلاف اپنے من

میں وِس گھول رہی ہو۔

کیوں نہ وِس گھولیں۔ کانتا بولی۔ ہم تو دیوی کے پاس صرف اس لیے آئی ہیں کہ پروٹسٹ کریں کیا دیوی کو نظر نہیں آتا کہ بندھنوں نے عورت کا بند بند لہولہان کر رکھا ہے۔ کیا عورت سارے بندھنوں سے کبھی آزاد نہ ہوگی۔

نہ نہ نہ نہ۔ بھاگی کے منہ سے عجیب سی آوازیں نکلیں۔ اس کا رنگ ہلدی کی طرح پیلا پڑ گیا۔ خوف کے مارے آنکھیں باہر نکل آئیں۔ نہ نہ نہ نہ وہ بولی۔ دیوی سے ایک بندھن کھولنے کی منّت کرو۔ کوئی ایک بندھن۔ پرنتو وہ باہر کا بندھن ہو بھیتر کا نہیں۔ جو تم نے سارے بندھن کھولنے کی پرارتھنا کی تو۔۔۔ نہ نہ نہ نہ ایسا نہ کرو۔ جو دیوی نے تمہاری سُن لی تو۔۔۔ تو کیا ہوگا۔

ایک ساعت کے لیے سب ڈر گئیں۔

کیا مطلب، کنول نے ہمت کر کے پوچھا۔

جو باہر بھیتر کے سارے بندھن ٹوٹ گئے تو۔۔۔ بھاگی نے خوف زدہ ہو کر کہا۔

ٹوٹ گئے تو۔۔۔ سبھی بوکھلا سی گئیں تو کیا۔

تو تم بھی مہامان کے سمان ہو جاؤ گی۔۔۔ بھاگی رُک گئی جیسے اس کے گلے میں آواز نہ رہی ہو۔

مہامان کے سمان۔ سب نے دہرایا۔

عین اس وقت سیوا کارن کی آواز سنائی دی۔ بھاگی۔

آواز سن کر بھاگی جیسے جاگ اُٹھی۔ طلسم ٹوٹ گیا۔ شرمندہ سی ہو گئی۔ دانتوں میں زبان دیے بھاگی۔

اس کے جانے کے بعد کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔ پھر کنول بولی۔ یہ کون تھی۔

کوئی مندر کی ہے۔

کیا کہہ رہی ہے۔

پتہ نہیں کیا کہہ رہی تھی۔

بے جوڑ باتیں کر رہی تھی۔

دیہاتن بولی۔ کہہ رہی تھی اگر دیوی نے تمہاری مانگ پوری کر دی۔ سارے بندھن کھول دیئے پھر کیا کرو گی۔

نانسنس۔ کانتا نے ناک چڑھائی۔

مجھے یہ مندر وندر دیوی ویوی۔ سب پاکھنڈ معلوم ہوتا ہے۔ پیلی ساڑھی والی پہلی مرتبہ بولی۔

جو ایسا ہے تو یہاں کیوں آئی ہو۔ کنول نے پوچھا۔

چاندی کے رسّے کو کھلتے دیکھنے آئی ہوں۔ پیلی ساڑھی والی نے کہا۔

کیا واقعی رسّہ کھلتا ہے۔

کہتے ہیں یوں تار تار ہو جاتا ہے جیسے دھو کر سوکھنے کے بعد بال کھلتے ہیں۔

پیلی ساڑھی والی اُٹھی۔ بولی سب پاکھنڈ ہے، نہ پرارتھنا سے کچھ ہو گا نہ ماتھا ٹیکنے سے، نہ منتوں ترلوں سے اگر اس سدا کی غلامی سے نجات پانا ہے تو اُٹھو جدوجہد کرو۔ جان لڑا دو ورنہ اس مرد کی دنیا میں عورت کا کوئی مقام نہیں۔

بالکل بالکل چاروں طرف سے شور مچ گیا۔

شہر سے دُور شاہراہ سے دُور، شوالک پہاڑیوں میں بجھی ہوئی پگڈنڈیوں کے بیچ درختوں سے گھرا ہوا ایک گاؤں ہے۔ ان پورنا۔ اس گاؤں سے ایک میل جنوب کی طرف ایک کھلا میدان ہے جس کے درمیان میں ایک بہت پرانا مندر ہے جسے کھل بندھنا کا مندر کہتے ہیں۔ یہ مندر اتنا پرانا ہے کہ کسی کو پتہ نہیں کہ کب تعمیر ہوا۔ اس کی بناوٹ بھی مندر کی سی نہیں۔ نہ مندر کا مخروطی گنبد نہ کلس۔

صدر دروازے سے داخل ہوتے ہی ایک بہت بڑا ہال کمرہ ہے جس کی چھت نیچی ہے ہال کمرے کے درمیان میں ایک چبوترے پر پتھر سے بنا ہوا قدِ آدم دیوی کا مجسمہ ہے جس کے خدوخال وقت کی کُھر دُبُرد کی وجہ سے گھسے پِٹے ہوئے ہیں صرف آنکھیں واضح ہیں جو لمبی اور ترچھی ہونے کی وجہ سے یوں ڈولتی محسوس ہوتی ہیں جیسے کشتیاں ہوں۔ دیوی کے

قریب ہی ایک موٹا سا چاندی کا رسہ چھت سے لٹک رہا ہے جو چاندی کی پتلی پتلی تاروں کو باٹ کر بنایا گیا ہے۔

ہال کمرے کے اردگرد تینوں طرف چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیاں بنی ہوئی ہیں جن کے اردگرد ایک چھوٹا سا برآمدہ چاروں طرف گھومتا ہے دیکھنے میں ایسے لگتا ہے جیسے وہ مندر نہیں بدھ مت کے پجاریوں کا پاٹ شالہ ہو۔

پرانے زمانے سے یہ پتھر کی بنی ہوئی عمارات دیوی کھل بندھنا کے مندر کے نام سے مشہور ہے۔ کسی کو علم نہیں کہ دیوی کا اصلی نام کیا ہے۔ سارے علاقے میں مشہور ہے کہ وہ بندھن کھول دیتی ہے۔

ہر سال بیساکھ کی پورن ماشی کے دن اردگرد کے علاقے سے عورتیں دیوی کے آگے سیس نوانے کے لیے آتی ہیں۔ کوئی پتی کے من میں پڑی ہوئی گرہ کھولنے کے لیے پرارتھنا کرتی ہے۔ کوئی بیٹے کے دل میں پریم بندھن کے خلاف ہاہا کار مچاتی ہے۔ کوئی ساس نند کے کرودھ کھولنے کی بنتی کرتی ہے۔ کوئی اولاد کی روک کا رونا روتی ہے۔

پورن ماشی کی رات شام ہی سے دیوی کا بھجن شروع ہو جاتا ہے۔ جوں جوں رات بھیگتی ہے مجمعے پر ایک کیفیت طاری ہونے لگتی ہے۔ پھر آدھی رات کے قریب بارہ ماتری درت لے شروع ہو جاتی ہے۔

'دیوی، کھل بندھنا'

اس پر سارے یاتری اُٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان پر وجدان کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ دل پر وجدان طاری ہو جائے تو سارے اعضاء رقص کرنے لگتے ہیں۔ کوئی برملا۔ کوئی گیت۔ جب یہ رقص اپنی انتہا پر پہنچتا ہے تو مندر میں ایک عجیب سی آواز پیدا ہوتی ہے۔ یوں جیسے آکاش سے گھنگھرو گرے ہوں۔

اس پر پجاری ساکت ہو کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ ٹھک ٹھک گھنگھرو بندھے پاؤں قدم قدم قریب آتے ہیں اور دیوی کے پاس آ کر رُک جاتے ہیں۔

عین اس وقت مندر کا مہا منتری سنکھ بجاتا ہے۔ سنکھ کی آواز سُن کر پھر سے کھل

بندھنا کا بھجن شروع ہو جاتا ہے۔ سنکھ روتا ہے ڈھولک سر پیٹتی ہے اور لوگ بھجن کے پردے میں آہ وزاری کرتے ہیں۔

عین اس وقت سیوا کارن جوگیا دھوتی میں ملبوس موتیے کے ہار لپیٹے دیوی کے گرد گھومنے لگتی ہے۔ تیز۔ تیز۔ اور تیز۔۔۔ ساتھ ہی چھت سے لٹکا ہوا چاندی کا رسّہ جھومنے لگتا ہے۔ اس جھولن جھومن میں رسّے کے بل کھلنے لگتے ہیں۔ کھلتے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ چاندی کی تاریں یوں ایک ایک ہو کر لٹکنے لگتی ہیں جیسے کسی مٹیار نے سکھانے کے لیے بال کھول رکھے ہوں۔

یہی دیوی کا معجزہ ہے۔ اسی لیے دیوی کا نام کھل بندھنا مشہور ہے۔

ساری چاتریاں ایک ایک کر کے مندر سے جا چکی تھیں۔ صرف کانتا، کنول، اور سیتے عورت کے بندھنوں کی شکایت کی زنجیر میں بندھی بیٹھی تھیں کہ مندر کی گھنٹی بجی۔ وہ تینوں چونکیں ان کے سامنے سیوا کارن کھڑی تھی۔ بولی مندر کے دوار بند کرنے کا سمے ہو گیا۔ اب تم اپنا ٹھکانہ کر لو۔

کہاں ہے ہمارا ٹھکانہ۔ کنول نے پوچھا۔

جس کوٹھڑی میں بھی جگہ ملے۔

اور جو کوٹھڑیوں کے دروازے بند ہوئے تو۔۔۔ کانتا نے پوچھا۔

تو کھٹکھٹاؤ۔۔۔ مندر میں کوئی رات بھر نہیں رہ سکتا۔ دیوی کی یہی آ گیا ہے۔

جب وہ مندر سے باہر نکلیں اور ایک نظر لمبے برآمدے پر ڈالی تو سیتے بولی۔ سب کوٹھڑیوں کے کواڑ بند ہیں۔ کسے کھٹکھٹائیں۔

باری باری سب کو بجا دو۔ کنول نے کہا۔

عین اس وقت برآمدے کے درمیان کی کوٹھڑی کا دروازہ چوں کر کے آپ ہی آپ کھل گیا۔ اندر سے دیئے کی مدھم روشنی باہر آنے لگی۔

اُنہوں نے کھلے کواڑ سے اندر جھانکا۔ کوٹھڑی خالی پڑی تھی۔ فرش پر سوکھی گھاس بچھی ہوئی تھی۔ دیوار کے آلے میں اک دیا ٹمٹما رہا تھا۔

جب وہ لیٹنے لگیں تو سیتے نے ڈر کر چیخ سی ماری۔ وہ دیکھو۔ وہ۔

محراب کے پیچھے کوٹھڑی کے پچھلے حصے میں ایک کھاٹ بچھی ہوئی تھی جس پر کوئی کالی چادر لپیٹے سو رہا تھا۔

کون ہے یہ۔ سیتے نے پوچھا۔

کوئی ہوگی۔ کانتا نے بے پرواہی سے کہا۔

آج تو ساری کوٹھڑیاں بھری ہوئی ہیں۔ کنول بولی۔

کنول۔ کانتا نے کہا۔ یہ مہامان کون تھی جس کا ذکر مندر والے کر رہے تھے۔

وہی جس کے سارے بندھن کھل گئے تھے۔

یہ طوطا مینا کہانی تم مان گئیں کیا۔ سیتے نے کہا۔ سب جھوٹ ہے جھوٹ!

اوں ہوں۔ جھوٹ نہیں۔ کوٹھڑی کے پچھلے حصے سے بھاری بھرکم آواز آئی۔

وہ تینوں چونک اٹھیں۔

تو کون ہے۔ سیتے نے بلند آواز سے پوچھا۔

میں ہی ہوں۔

اس کی آواز کو کیا ہے۔ کنول نے زیرلب پوچھا۔ عورت کی سی نہیں۔

رو رو کے میرا گلا رُندھ گیا ہے۔ کالی چادر والی نے کہا۔

تو مہامان کو جانتی ہے کیا۔ کانتے نے پوچھا۔

جانتی ہوں۔ میں اس کی بالکی ہوں۔ کالی چادر والی اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

لیکن وہ کوٹھڑی کی طرف پیٹھ کئے ہوئے تھی۔

مہامان کے سارے بندھن ٹوٹ گئے تھے کیا؟

مہامان کون تھی؟

اس پر کیا بیتی؟

کوئی کچھ نہ کچھ پوچھ رہی تھی۔

پھر کوٹھڑی پر خاموشی چھا گئی۔

دفعتہ کالی چادر والی بولی۔

مہامان کے مات پتا ندرکوٹ کی ریاست میں رہتے تھے۔ گھر کھانے کو سوکھی روٹی کے سوا کچھ نہ تھا۔ جب مہامان ان کے گھر پیدا ہوئی تو ماں باپ کے دل میں اُمید کا دیا ٹمٹمایا کہ پُتری بڑی ہو گی تو ریاست کے مہاراجہ کی بھینٹ کریں گے چھوٹی موٹی جاگیر مل جائے گی۔ جیون سُکھی ہو جاوے گا۔

مہاراجہ کی بھینٹ۔ کنول نے حیرت سے دہرایا۔

ہاں مہاراجہ کی بھینٹ۔ ان دنوں یہ رواج تھا۔

ماں باپ سندر پُتریاں مہاراجہ کی بھینٹ کر دیتے تھے۔ مہاراج چار ایک روج کلی کا رس چُوستے۔ پھر اسے پُرانے محل میں پھینک دیتے جہاں مہاراج کے نوکر چاکر پھول کی پنکھڑیاں نوچتے اور پھر جب وہ ڈنٹھل بن جاتی تو کال کوٹھڑی میں دھکیل دیتے۔ یہی ان دنوں کی رِیت تھی۔

پُتری سندر تھی۔ مات پِتا نے اس کا نام شوبھا رکھ دیا۔ کالی چادر والی نے آہ بھر کر کہا۔

شوبھا کون۔ سیتے گنگنائی۔

وہی کالی چادر والی نے آہ بھر کر کہا جو مندر میں آ کر تپسیا کرتے کرتے مہامان بن گئی۔

وہ تینوں چپ چاپ بُت بنے بیٹھی تھیں۔

مات پِتا نے شوبھا کے پیٹ اور گالوں پر حلوہ باندھ باندھ کر پُتری کو بڑا کیا کہ پیٹ ملائم رہے گال چکنے ہو جائیں۔ سینے پر سمندر جھاگ ملی کہ اُبل کر اُبھرے۔ منہ پر دودھ کے چھینٹے دیئے کہ رس بھر جائے۔ رانوں پر گھی کی مالشیں کیں کہ لچک بڑھے۔ کمر پر کمر بند کس دیا کہ ربٹ کے گیند کی طرح یوں اُبھر اُبھر کر جھٹکے۔

توبہ ہے سیتے نے آہ بھری۔

جب شوبھا بڑی ہوئی تو اس میں وہ سب کچھ تھا جو مات پِتا نے چاہا تھا۔ جسم تیار تھا پر من میں اڑن تھی۔

اڑن کیوں، کنول نے پوچھا۔

جب شوبھے کو پتہ چلا کہ اسے بھینٹ بنایا جا رہا ہے تو اس کے من نے کہا میں سب کچھ بنوں گی۔ پر بھینٹ نہ بنوں گی۔ مجھے تھالی میں پروسن کر دوجے کے سامنے نہ دھرا جائے میں کنیا ہوں، کھاجا نہیں ہوں۔

جب وہ اسے راجہ کے محل میں لے کر گئے تو حواریوں نے اُسے اچھی طرح دیکھا کہ راجہ کے لائق ہے بھی یا نہیں۔ پھر وہ اسے مہاراج کی سیج پر بٹھا کر چلے گئے کہ مہاراج ابھی آتے ہیں۔

وہ وہاں سے اُٹھ بھاگی۔ کھڑکی سے باہر نکلی۔ پر نصیبے کا لکھا کون مٹا سکے ہے۔ باہر کے کواڑ کی بجائے بھیتر کے کواڑ میں سے ہو کر پُرانے محل میں جا پہنچی جہاں مہاراج کے نوکر تاک میں بیٹھے تھے۔

پتہ نہیں کتنے روج بھیڑیے اسے بھنبھوڑتے رہے۔ پر ایک دن وہ وہاں سے نکل بھاگی۔

پریم گاگریا جگہ جگہ سے تڑخ چکی تھی۔ اب اس میں دودھ بھرنے کی بات نہ رہی تھی اس لیے وہ سیدھی شار جانائیکہ کے پاس پہنچی۔ بولی لے نائیکہ مجھے بیچ اور کھا۔ اپنی جھولی بھر۔ اب میں کسی اور کام کی نہیں رہی۔ کالی چادر والی خاموش ہو گئی۔

دیر تک کوٹھڑی گُم سُم رہی جیسے اُوپر چُپ کا تنبو تنا ہو۔ صرف دل دھک دھک کر رہے تھے۔ گردنیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ سینوں کی نوکیں اُبھر کر کانٹے بن گئی تھیں۔

پھر کالی چادر والی نے ایک لمبی آہ بھری۔ بولی پھر شوبھا کا وہ چرچا ہوا وہ چرچا ہوا کہ مہاراج کے درباری بھی اس کے دوار پر کھڑے ہو کر انتجار کرنے لگے یہاں تک کہ اک دن مہاراج خود چوبارے پر آ پہنچے۔

شوبھا کے پاس کیا نہ تھا۔ پوشاکیں، جیور، ہیرے جواہرات اور دھن۔ دھن ہی دھن۔ اوپر سے وہ پھول سمان کھلی کھلی تھی پر بھیتر میں ایک کانٹا لگا تھا۔ سوچتی کتنی اپرادھن ہوں میں کہ جگہ جگہ بوٹیاں تڑوائیں، بکی پر ماتا پتا کو جاگیر نہ لینے دی۔ ان کا سودا کھوٹا کر دیا۔ پتہ نہیں اب کس حال میں ہیں۔

اس کانٹے نے اس کے بھیتر کو لہولہان کر دیا۔ خود کو اپرادھن جاننے لگی تو پھر رہا نہ گیا۔ گہنے پاتے کی گٹھڑی باندھی اور چوری چوری چوبارے سے نکل گئی۔

ماتا پتا کو اپنی قیمت چکانے کے لیے گاؤں پہنچی تو پتہ چلا کہ وہ بھوک کے مارے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گئے۔ کالی چادر والی پھر رُک گئی۔

تینوں چھوکریاں یوں بیٹھی تھیں جیسے مایا اُتر گئی ہو۔ استری ٹوٹ گئی ہو۔ جیسے پاپڑ سے کڑا کا نکل گیا ہو۔

شوبھا کی آنکھوں میں دُنیا اندھیر ہو گئی۔ کالی چادر والی یوں بولی جیسے آواز بھیگ گئی ہو۔ دوسُریں اور گر گئی ہو۔ کالی چادر والی پھر رُک گئی۔

پھر۔۔۔ سیتے گھگیائی۔

پھر۔۔۔ کالی چادر والی نے دہرایا۔ پھر شوبھا کی نظر میں جیسے سب کچھ۔ کچھ بھی نہیں ہو گیا۔ دھن دولت بانٹ دی اور کھل بندھنا کے دوار پر آ بیٹھی۔ دیوی باہر کے بندھن تو ٹوٹ گئے۔ بھیتر کے بھی کھول دے۔ کالی چادر والی آہ بھر کر بولی۔

بھیتر کے دو بندھن اسے جکڑے ہوئے تھے۔ اک یہ کہ اس نے ماتا پتا کا اپمان کیا تھا۔ اور دُوجا۔۔۔ کانتا کے ہونٹ ہلے پر کالی چادر والی چپ رہی۔

پھر۔۔۔ کنول کی آواز سنائی دی۔ پر وہ بُت بنی بیٹھی رہی۔ بیٹھی رہی۔

پھر دُور کوئی بالک رویا تو کالی چادر والی چونکی۔ بولی سنو سنو دوجا بندھن آپ ہی بول پڑا۔ اس کے من میں اک بالک روتا تھا، ممتا سر پیٹتی تھی۔ چھاتیاں سر اُٹھا اُٹھا کر بین کرتی تھیں۔ وہ تھیلی تڑپتی تھی جہاں بالک آنا چاہے تھا۔ من لہو کے آنسو روتا تھا۔ جوں جوں بالک روتا، توں توں شوبھا دیوی کے چرنوں میں تڑپ تڑپ کر بنتی کرتی۔ آدھی آدھی رات کے سمے دیوی کے بھجن گاتی۔۔۔ دیوی۔۔۔ کھل بندھنا۔

اس نے اتنی تپسیا کی۔ اتنی تپسیا کی مہامان بن گئی۔

پھر ایک رات وہ دیوی کے چرنوں میں سیس نوائے بیٹھی تھی تو مندر میں ایک ہلکی آواز اُبھری، ''چپ'' اس نے سر اُٹھا کر دیکھا تو دیوی نے اپنی انگلی ہونٹوں پر رکھی ہوئی تھی اور

سارا مندر چُپ چُپ گنگنا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر اس نے اُلٹا اپنی مانگ کو دہرانا شروع کر دیا۔ پھر ایک کرودھ بھری آواز اُبھری۔ اندھی منگتی اپنی مانگ کو جان۔ اس پر بھی وہ نہ سمجھی تو دیوی بولی استری بندھن ہی بندھن ہوتی ہے۔ جو بھیتر کے بندھن بھی کھل گئے تو استری، استری نہ رہے گی۔ یہ سن کر وہ ڈر گئی پر سمجھی پھر بھی نہیں۔

دیوی بولی۔ استری لیروں کے کھدوسمان ہوتی ہے۔ لیریں نکال دو تو کھدو کہاں رہے گا۔

وہ پھر بھی نہ سمجھی اُلٹی پھر سے بھجن رٹنے لگی۔ دیوی کھل بندھنا۔ ناچ ناچ کر دیوی کو منانے لگی۔

پھر دیوی جیسے کرودھ میں بولی "جا تیرے بھیتر کے بندھن کھل گئے۔"

اس پر مندر ڈولنے لگا جیسے بھونچال آ گیا ہو اور مہامان گر پڑی۔ کالی چادر والی نے چادر لپیٹی اور اُٹھ بیٹھی اور قدم قدم ان کی طرف چل پڑی۔

جب وہ محراب کے نیچے پہنچی تو سیتے بولی، پھر کیا ہوا۔

وہ رُک گئی۔ پھر کیا ہوا۔

ہاں ہاں پھر کیا ہوا۔

پھر۔۔۔ کالی چادر والی نے اپنے منہ سے چادر اُٹھا دی۔۔۔ پھر یہ ہوا۔۔۔ یہ۔

انہوں نے سر اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ دہشت سے ان کی چیخیں نکل گئیں۔ ان کے سامنے پتہ نہیں کون سی مخلوق کھڑی تھی۔ نہ عورت تھی نہ مرد۔

تینوں لڑکیوں نے خوف زدہ ہو کر منہ چھپا لیے۔

بھاگی نے سیوا کارن کا دروازہ زور سے کھٹکھٹایا۔ سُن رہی ہو سیوا کارن سُن رہی ہو۔ وہ دیوی کے چرنوں میں بھجن بھینٹ کر رہی ہے۔

سیوا کارن بھاگی بھاگی باہر نکلی۔ دونوں مندر کے بڑے دروازے کی طرف دوڑیں مہامان کی کوٹھڑی کی کنڈی کھل گئی مجھے پتہ تھا کہ اک دن ابھاگنی کا چکر ٹوٹ جائے گا۔ سیوا کارن تو سُن تو سہی۔ بھاگی چلائی۔

وہ سب سننے لگیں۔

کھل بندھنا۔ بندھ دے۔

سُنا تو نے۔ بھاگی چیخی۔ مہامان نے بول بدل دیئے۔ ہاں سیوا کارن بولی۔ مہاجوگی کہتے تھے ایک دِن آئے گا جد چاندی کا رستہ نہیں کھلے گا۔

اے دیوی تیری جے ہو۔

سیوا کارن نے ہاتھ جوڑ کر ماتھے پر رکھ لیے۔ اندر کوئی گائے جارہی تھی۔

کھل بندھنا، بندھ دے۔ کھل بندھنا۔

-☆-

روغنی پُتلے

شہر کا الیٹ شاپنگ سنٹر۔۔۔ جس کی دیواریں شلف الماریاں بلور کی بنی ہوئی ہیں جس کا بنا سجا فے کیڈ جلتے بجھتے رنگ دار سائنز سے مزین ہے۔ جس کے کاؤنٹرز مختلف رنگوں کے گلوکلرز پینٹس کی دھاریوں سے سجے ہوئے ہیں اور شلف دیدہ زیب سامان سے لدے ہوئے ہیں جس کے کاؤنٹروں پر سمارٹ متبسم لڑکیاں اور لڑکے یوں استادہ ہیں جیسے وہ بھی پلاسٹک کے پتلے ہوں! جوان کے اردگرد یہاں وہاں سارے ہال میں جگہ جگہ رنگا رنگ لباس پہنے کھڑے ہیں۔۔۔ ہاں فیشن آرکیڈ سے کون واقف نہیں۔

چاہے انہیں کچھ نہ خریدنا ہو لوگ کسی نہ کسی بہانے فیشن آرکیڈ کا پھیرا ضرور لگاتے ہیں۔ وہاں گھومتے پھرتے نظر آنا ایک حیثیت پیدا کر دیتا ہے۔ کچھ پاش چیزوں اور نئے ڈیزائنوں کو دیکھنے آتے ہیں تاکہ محفلوں میں لیٹسٹ فیشن کی بات کر کے اپ ٹو ڈیٹ ہونے کا رعب جما سکیں۔ نوجوان آرکیڈ میں گھومنے پھرنے والیوں کو نگاہوں سے ٹٹولنے آتے ہیں۔ غنڈے سیل گرلز سے اٹا سٹا لگانے کی کوششیں کرتے ہیں لڑکیاں اپنی نمائش کے لیے آتی ہیں۔ بوڑھے خالی آنکھیں سینکتے ہیں۔ گھاگ بیگمات گرین یوتھ کی ٹوہ میں آتی ہیں۔ وہ صرف فیشن آرکیڈ ہی نہیں رومان آرکیڈ بھی ہے کیوں نہ ہو آج محبت بھی تو فیشن ہی ہے۔

کون سی چیز ہے جو فیشن آرکیڈ مہیا نہیں کرتا۔ زربفت سے گاڑے تک۔ موسٹ ماڈرن گیجٹس سے سوئی سلائی تک۔ سی تھرو سے رنگین مالاؤں تک سب کچھ وہاں موجود ہے لوگ گھوم گھوم کر تھک جاتے ہیں تو آرکیڈ کے ریستوران میں کافی کا پیالہ لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔

فیشن آرکیڈ کی اہمیت کا یہ عالم ہے کہ فارن ڈگنیٹریز نے خرید وفروخت کرنی ہوتو انہیں خاص انتظامات کے تحت آرکیڈ میں لایا جاتا ہے۔

آرکیڈ ہال میں جگہ جگہ روغنی پتلے طرح طرح کا لباس پہنے کھڑے ہیں چہروں پر جوانی کی سرخی جھلملا رہی ہے۔ آنکھوں میں دعوت بھری چمک ہے۔ ہونٹوں پر رضامندی بھرا تبسم کھدا ہے۔ جسم کے پیچ وخم ہر لحظہ یوں ابھرتے سمٹتے محسوس ہوتے ہیں جیسے سپردگی کے لیے بے تاب ہوں۔

اگرچہ ڈمی پتلے پلاسٹک کے جمود میں مقید ہیں مگر صناع نے انہیں ایسی کاریگری سے بنایا ہے کہ ان کے بند بند میں حرکت کی الیوژن لہریں لے رہی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ رواں دواں ہوں۔

سی تھرو لباس والی پتلی کو دیکھو تو ایسے لگتا ہے جیسے وہ ابھی اپنی برہنہ ٹانگ اٹھا کر کہے گی۔ ''ہئے مجھے سنبھالو میں گری جارہی ہوں۔'' اور جیکٹ والا اپنی عینک اتار کر مونچھوں کو لٹکاتے ہوئے چل پڑے گا۔ ''ہولڈ آن ڈارلنگ، میری گود میں گرنا۔''

آرکیڈ میں بہت سی پتلیاں پوز بنائے کھڑی ہیں۔ منی سکرٹ والی، ساڑھی والی، بیدنگ کاسٹیوم والی، میکسی والی، سی تھرو لباس والی، لٹکتے بالوں والی، پتلون والی، ننگے پاؤں والی، ہپن، ٹوکرا بالوں والی، انگلی سے لگے بچے والی۔

ان کے ساتھ ساتھ پُتلے کھڑے ہیں شکاری جیکٹ والا، دانشور، موٹر سائیکل والا، بلیک سوٹ، اچکن، ہپی، کُرتے پاجامے والا، سٹوڈنٹ، ڈینڈی، مصور۔

آرکیڈ ہال کے اوپر دیوار کے ساتھ ساتھ ایک گیلری چلی گئی ہے جہاں نظروں سے اوجھل دکان کا کاٹھ کباڑ پڑا ہے پرانی میزیں کرسیاں شلف اور پُتلے جن کا رنگ روغن اُڑ چکا ہے۔

رات کا وقت ہے آرکیڈ بند ہو چکا ہے ہال میں سات آٹھ بتیاں روشن ہیں۔ شیشے کی دیواروں کی وجہ سے ہال جگمگ کر رہا ہے۔

گھڑی نے دو بجائے۔ سارے ہال میں حرکت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ پتلوں نے

آنکھیں کھول دیں۔ پُتلیوں کی لمبی لمبی پلکیں یوں چلنے لگیں جیسے پنکھیاں چل رہی ہوں۔

سی تھرو نے انگڑائی لی۔

منی سکرٹ نے اپنی ٹانگ اٹھائی۔

جیکٹ والے دانشور نے اپنا قلم جیب میں ٹانگا۔ عینک صاف کی اور سی تھرو کی طرف بھوکی نظروں سے دیکھنے لگا۔

موٹر سائیکل والے نے پیچھے بیٹھی لٹکتے بالوں والی پر گلیڈ آئی چمکائی لٹکتے بالوں والی سے چھینٹے اُڑنے لگے۔

''مائی گاڈ'' سی تھرو چلائی یہ دیکھواس نے اپنی ٹانگ لہرائی میری ٹانگ پر نیلی رگیں اُبھرآئی ہیں کھڑے کھڑے۔

کیوں نہ ہو بلیو بلڈ ہے۔ بلیک سُوٹ مسکرایا۔

دور سے ایک آواز آئی۔ ''ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلی میں'' سب کوک بکس کے پاس کھڑی پتلون والی کی طرف دیکھنے لگے۔

''تیرے ہاتھ تو خالی ہیں۔ کہاں ہے ساغر'' کُرتے پاجامے والے نے پوچھا۔

''اندھے وہ تو خود ساغر ہے۔ دکھتا نہیں تجھے'' جین والا ہنسا۔

''میں تو بور ہوگئی'' منی سکرٹ نے آنکھیں گھما کر کہا۔

''کیوں مذاق کرتی ہو'' موٹر سائیکل نے گلیڈ آئی چمکائی۔

''تم تو سراپا حرکت ہو تمہاری تو بوٹی بوٹی تھرکتی ہے، تم کیسے بور ہو سکتی ہو۔''

— ''کیوں بناتے ہو اسے اس کے جسم پر بوٹی ہی نہیں تھرکے گی کہاں سے۔'' دور کونے میں کھڑے اچکن والے نے کہا۔

''ہاں'' پہلوان نما کُرتے والے نے سر اثبات میں ہلایا۔ ''وہ تو ٹمیار کا زمانہ تھا جب بوٹی بوٹی تھرکا کرتی تھی اب تو کاٹھ ہی کاٹھ رہ گیا ہے۔''

''شٹ اپ'' جین والے نے آنکھیں دکھائیں۔ ''اپنے دقیانوسی رجعت پسندانہ خیالات سے فیشن آرکیڈ کی فضا کو متعفن نہ کرو۔''

''اے مسٹر اچکن'' اسٹوڈنٹ چلّایا۔ ''ذرا آئینہ دیکھو یوں لگتے ہو۔ جیسے سارنگی پر غلاف چڑھا ہو۔''

''یہ مسٹر اچکن تو خالص ہسٹری ہے، ہسٹری۔ اسے تو میوزیم میں ہونا چاہیے۔''

''این ٹیکس میوزیم میں۔'' جیکٹ والے نے قہقہہ لگایا۔

''بالکل۔ ان روایتی لوگوں کو جینے کا کوئی حق نہیں۔''

''یہ لوگ زندگی کو کیا جانیں۔''

''ہپوکرِٹس'' ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں۔

''اِگنور ہم، ہٹاؤ۔ کوئی اور بات کرو'' سی تھرو آنکھیں گھما کر بولی۔

''ہاؤ کین وی اِگنور ہم۔ یہ لوگ ہمارے راستے کی رکاوٹ ہیں۔''

''نان سنس ہمارے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ وی آر آل فار پروگرس موومنٹ۔'' جیکٹ والا چلّا کر بولا۔

''ہیئر ہیئر'' تالیوں سے ہال گونجنے لگا۔

''ہاہاہا'' اوپر گیلری میں کوئی قہقہہ مار کر ہنسا۔ اس کی آواز کھرج تھی انداز والہانہ تھا تالیاں رُک گئیں۔ ہال میں خاموشی چھا گئی۔ پھر سرگوشیاں اُبھریں۔

''کون ہے یہ۔''

''کون ہنس رہا ہے۔''

''پتہ نہیں اوپر سے آواز آ رہی ہے۔''

''ہئے میں تو ڈر گئی کتنی ہورس آواز ہے۔''

قہقہہ رُک گیا۔ پھر قدموں کی آواز سنائی دی ٹھک ٹھک ٹھک۔

''کوئی چل رہا ہے اُوپر۔''

''ہئے میری تو جان نکلی جا رہی ہے۔''

''پتہ نہیں کون ہے'' منی سکرٹ بولی۔

''ڈونٹ فیر ڈارلنگ۔ آئی ایم ہیر بائی یُر سائیڈ۔''

''وہ دیکھو وہ'' ٹو کرا بالوں والی نے اوپر کی طرف اشارہ کیا۔
''اُوپر۔۔۔گیلری کے جنگلے پر'' ساڑھی والی ڈر کر بولی۔
سب کی نگاہیں اوپر جنگلے کی طرف اُٹھ گئیں۔
گیلری کی ریلنگ سے ایک بڑا سا بھیانک چہرہ جھانک رہا تھا۔
''توبہ ہے''۔''اُف''۔''ہائے''۔پتلیوں نے شور مچا دیا۔
''کون ہے تو''۔موٹر سائیکل والا اپنا سائیلنسر نکال کر غرایا۔
''میں وہ ہوں جو ایک روز مشہدی لنگی باندھے وہاں کھڑا تھا جہاں آج تُو کھڑا ہے۔''
''اس کی آواز اتنی بھدّی کیوں ہے'' سی تھرو نے سینہ سنبھالا۔
''کہاں سے بول رہا ہے یہ'' پتلون والی نے پوچھا۔
''میں وہاں سے بول رہا ہوں جہاں بہت جلد تم پھینکی جانے والی ہو۔'' لنگی والا کہنے لگا۔

پتلیوں کا رنگ زرد پڑ گیا۔ان کے منہ سے چیخیں سی نکلیں۔''نو نو۔نو نو'' نیور، مائی گاڈ ہئے اللہ''۔وہ سب سہم کر پیچھے ہٹ گئیں۔
''ڈونٹ مائنڈ ہم ڈارلنگ'' جین والا بولا۔''یہ تو پِٹا ہوا مہرہ ہے۔پٹے ہوئے مہرے سے کیا ڈرنا۔''
''دیٹس اِٹ، دیٹس اِٹ دے بی لونگ ٹو دی پاسٹ۔''
''یہ اب بھی ماضی میں رہتے ہیں اور ہم کو ماضی کی طرف گھسیٹنا چاہتے ہیں''۔جیکٹ والا حقارت سے بولا۔
''بڑے میاں سلام'' جیکٹ والے نے ماتھے پر ہاتھ مار کر طنزیہ سلام کیا۔''ماضی پرستی کا دور ختم ہوا۔حضرت اب جدیدیت کا زمانہ ہے۔
گیلری میں اوندھا پڑا ہوا رومی ٹوپی والا لنگڑا سوٹی پکڑ کر اٹھ بیٹھا۔''احمق ہیں یہ جدیدیت کے دیوانے اتنا بھی نہیں جانتے کہ اس دنیا میں نہ قدیم ہے نہ جدید جو آج جدید ہے وہ کل قدیم ہو جائے گا۔''

''یہ ظاہر کے دیوانے کیا سمجھیں گے۔'' مشہدی لنگی والے نے قہقہہ لگایا۔ ''کہ دور ایک گھومتا ہوا چکر ہے جو آج اوپر ہے کل نیچے چلا جائے گا۔ جو آج نیچے ہے کل اوپر آ جائے گا۔''

جین والے نے اپنی پتلون جھاڑی۔ ''ان کباڑ خانے والوں کی باتیں نہ سنو یہ بے چارے کیا جانیں جدیدیت کو۔''

''جدیدیت کے دیوانے آج تیری پتلون کے پائنچے کھلے ہیں کل تنگ ہو جائیں گے پرسوں پھر کھل جائیں گے یہی ہے نا تیری جدیدیت۔'' رومی ٹوپی والے نے قہقہہ لگایا۔

''ذرا اس کی جین کی طرف دیکھو'' لنگی والا بولا۔ ''نیلی پتلون پر سرخ ٹلی لگی ہوئی ہے ہاہا۔ ہاہا'' وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔

''احمق یہ ٹلی نہیں۔ پیچ ہے پیچ۔ پیچ فیشن ہے۔ پیچ لگی جین کی قیمت عام پتلون سے دُگنی ہوتی ہے تجھے کچھ پتہ بھی ہو۔''

''پیوند کبھی غربت کا نشان تھا۔ پیوند لگے کپڑوں والے سے لوگ یوں گھن کھاتے تھے جیسے کوہڑی ہو۔ آج تم اس پیوند کی نمائش پر فخر محسوس کر رہے ہو۔'' مشہدی لنگی والا ہنسنے لگا۔ ''تم عجب تماشہ ہو۔''

رومی ٹوپی والے نے قہقہہ لگایا۔ ''دورِ جدید کے تخیل کا فقدان ملاحظہ ہو پیوند کو فیشن بنا بیٹھے ہیں۔ ہی ہی ہی۔''

''سارا کریڈٹ ہمیں جاتا ہے۔'' ہپن نے سر اُٹھا کر کہا۔

''ہائیں یہ کیا کہہ رہی ہے۔'' پتلون والی نے پوچھا۔

''لو'' سی تھرو زیرِ لب گنگنائی۔ ''چھلنی بھی بولی۔''

''ہاں'' ہپی نے سینے پر ہاتھ مارا۔ ''سارا کریڈٹ ہمیں جاتا ہے۔''

''تعفن کا کریڈٹ غلاظت کا کریڈٹ اور کونسا۔'' بیدنگ کاسٹیوم والی بولی۔

ساڑھی والی نے ناک چڑھائی۔

ہپی نے قہقہہ لگایا۔ ''جدیدیت کے ذہنی تعفن کو دُور کرنے کا کریڈٹ۔ جدیدیت کے

بُت توڑنے کا کریڈٹ۔ چھوٹی قدروں کو پاؤں تلے روندنے کے لیے ہمیں غلاظت کو اپنانا پڑا۔"

سپورٹس گرل نے بیڈمنٹن ریکٹ کو گھما کر دانت نکالے۔

"ڈینٹل کریم کا اشتہار کسے دکھا رہی ہو۔" ہپی ہنسا۔ ہم نے دورِ حاضرہ کے سب سے بڑے بُتِ دولت کو پاش پاش کر دیا۔ ہم نے جھوٹے رکھ رکھاؤ کا بت ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیا۔ ہم نے ماڈرن ایج کے واحد دل بہلاوے سمال کمفرٹس کی نفی کر دی ہم نے مغربی تہذیب کا جنازہ نکال دیا۔

"یہ بے چارے کیا جانیں"۔ ہپن بولی۔ "ظاہریت کے متوالے۔ جب کوئی تہذیب متعفن ہو جاتی ہے تو اسے مسمار کرنے کے لیے مجاہد بھیج دیئے جاتے ہیں ہم وہ مجاہد ہیں۔"

"تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی۔" رومی ٹوپی والے نے قہقہہ لگایا۔

"بالکل درست" لنگی والا چلّایا۔ "یہ ٹرانزیشنل دور ہے۔ جب ایک شو ختم ہو جاتا ہے تو دوسرے شو کے واسطے ہال صاف کرنے کے لیے جمعدار آ جاتے ہیں۔ یہ دور جمعداروں کا دور ہے۔"

"سِلّی فول" سی تھرو ہنسی۔ "یہ تو رومانس کا دور ہے۔"

"رومانس" گیلری کے کاٹھ کباڑ سے ایک مجنوں صفت دیوانہ لپک کر ریلنگ پر آ کھڑا ہوا۔ "تم کیا جانو رومان کیا ہوتا ہے۔۔۔ تمہارے دور نے تو عشق کا گلا گھونٹ دیا۔ عاشق کو غنڈہ بنا کر رکھ دیا۔ محبوب سے محبوبیت چھین کر اسے رنڈی بنا دیا۔ عریانی کو رومان نہیں کہتے بی بی۔"

"بالڈر ڈیش۔"

"نانسنس۔"

رومی ٹوپی نے ایک لمبی آہ بھری۔ "دوستو ہمارے زمانے میں عورت کا نقاب سرک جاتا تھا۔ تو گال دیکھ کر مرد میں تحریک پیدا ہوتی تھی۔ لیکن اب ننگے پنڈوں کی یلغار نے

مردانہ حس کو گُند کر دیا ہے۔ تمہارے دور نے مرد کو نامرد اور عورت کو بانجھ کر کے رکھ دیا ہے۔''

جیکٹ والا آگے بڑھا۔ اس نے قلم جیب میں ڈالا عینک اتاری۔ ''ہم جنس کے متوالے نہیں، ہم جنس کی لذت کی دلیل میں ڈوبے ہوئے نہیں ہیں۔ دورِ حاضر میں سب سے اہم ترین مسئلہ اقتصادیات کا ہے۔ تم حالاتِ حاضرہ سے چشم پوشی کرتے ہو۔ ہم تمہاری طرح حالاتِ حاضرہ سے آنکھیں نہیں چراتے۔ ہم ترقی پسند لوگ ہیں۔''

''حالاتِ حاضرہ''۔ رومی ٹوپی والے نے قہقہہ لگایا۔ تمہارے نزدیک حالاتِ حاضرہ روٹی کپڑا اور مکان ہیں۔ ہمارے نزدیک سب سے بڑا مسئلہ اَنا کا ہے۔ سلف کا۔ ''مَیں'' کا۔

''روٹی کپڑے والو ہماری طرف دیکھو'' ہپن چلائی۔ ''جو ملتا ہے کھا لیتے ہیں جہاں بیٹھ جاتے ہیں وہی ٹھکانہ بن جاتا ہے۔ جو میسر آتا ہے پہن لیتے ہیں۔ کہاں ہیں وہ مسئلے جنہیں تم اہرامِ مصر بنائے بیٹھے ہو۔''

''اُوں ہُوں انہیں کچھ نہ کہو یہ تو فارن خیالات کی ایڈ کے بل بوتے پر کھڑے ہیں انہیں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' رومی ٹوپی والا بولا۔

''کل جب روٹی کپڑا اور مکان کا مسئلہ حل ہو جائے گا پھر تمہارے ہاتھ پلے کیا رہ جائے گا بتاؤ۔'' ہپن بولی۔

''یہ تو حرکت کے متوالے ہیں، منزل کے نہیں۔ انہیں صرف چلنے کا شوق ہے، پہنچنے کا نہیں۔'' مشہدی لنگی والے نے منہ بنایا۔

''بکو نہیں۔ ہمارے راستے میں جو شخص روڑے اٹکائے گا اس پر رجعت پسندی کا لیبل لگا دیا جائے گا۔''

ہپی قہقہہ مار کر ہنسا ''سوواٹ، ہم ہپیوں پر رجعت پسندی کا لیبل لگاؤ بے شک لگاؤ۔ ہم نے کیپٹل ازم کی بنیادیں کھوکھلی کر دی ہیں۔ ہم نے اقتدار پسندی کا تمسخر اُڑایا ہے، ہم میں اور ان گوریلوں میں کیا فرق ہے جو سرمایہ داری کے خلاف جان کی بازی لگائے بیٹھے ہیں۔''

''صرف یہی کہ طریقِ کار مختلف ہے''۔ پپن نے لقمہ دیا۔

ہال پر سناٹا چھا گیا۔

سی تھرو اپنے جسم کے پیچ وخم کا جائزہ لے رہی تھی۔ ساڑھی اپنا پلّو سنبھال رہی تھی۔ لٹکے بالوں والی منہ میں انگلی ڈالے کھڑی تھی۔ پتلون والی کا چہرہ حقارت سے چقندر بنا ہوا تھا۔ جیکٹ والا سر کھجاتے ہوئے گنگنا رہا تھا۔ ''کتابوں میں تو یہ بات کہیں نظر سے نہیں گزری۔''

مجنوں نُما نے قہقہہ لگایا۔ ''خود کو زندگی کے متوالے گردانتے والے کتابوں کی بیساکھیوں کے سہارے کے بغیر چل نہیں سکتے۔ زندگی کتابوں سے اخذ نہیں کی جاتی مسٹر زندگی حال ہے کسی صاحبِ حال سے پوچھو۔''

''جو قیل وقال کے دیوانے ہیں انہیں حال کا کیا پتہ۔'' لنگی والا بولا۔ ''انہیں اتنا نہیں پتہ کہ حال پر قیل وقال نہیں ہو سکتا۔ حال کو رڈ نہیں کیا جا سکتا۔ حال سب سے بڑی حقیقت ہے۔''

ہال پر خاموشی چھا گئی۔

پھر دُور سے ایک سرگوشی اُبھری۔۔۔ ''میں کہاں آ پھنسی ہوں'' ۔۔۔ بچے کو اُنگلی لگائے کھڑی ماں گنگنا رہی تھی۔ ''یہ دور ماں کا دور نہیں۔ یہ تو عورت کا دور ہے۔ میں کہاں آ پھنسی ہوں۔''

''عورت کا نہیں بی بی۔'' پہلوان کُرتے والے نے سر ہلا کر کہا۔ ''یہ تو لڑکی کا دور ہے انہیں کیا پتہ کہ عورت کسے کہتے ہیں۔ بال سفید ہو جاتے ہیں پھر بھی یہ لڑکیاں ہی بنی رہتی ہیں۔''

''خاموش'' آرکیڈ کی فرنٹ رو میں کھڑی ٹوکرا بالوں والی بولی ''سُنو، سُنو یہ کیسی آواز ہے۔''

''کون سی آواز؟''

''کدھر ہے آواز۔''

''چپ۔'' ٹوکرا بالوں والی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ لی۔

سب کان لگا کر سُننے لگے۔

''ارے'' موٹر سائیکل والا چلایا۔ ''یہ تو ٹیلیفون کی گھنٹی بج رہی ہے۔''

''یہ آواز تو باہر سے آ رہی ہے۔'' منی سکرٹ والی نے کہا۔

جیکٹ والے نے عینک صاف کی اور باہر دیکھنے لگا۔

''ہائے اللہ'' سی تھرو بولی۔ ''یہ آواز تو ایمر جنسی فون بوتھ سے آ رہی ہے۔ وہ جو باہر پورٹیکو میں ہے۔''

''خاموش'' شکاری ڈانٹ کر بولا۔ ''سب اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو جاؤ۔۔۔وہ آ رہا ہے۔''

''کون آ رہا ہے'' سی تھرو نے زیرِ لب پوچھا۔

''چوکیدار۔''

''چوکیدار'' پُتلیاں سہم کر پیچھے ہٹ گئیں۔ پُتلے باہر جھانکنے لگے۔

سامنے ایک اُونچا لمبا جہلمی جوان خاکی وردی پہنے سر پر پگڑی لپیٹے ہاتھ میں سونٹا اُٹھائے بوتھ کی طرف بھاگا آ رہا تھا۔

''بالکل اُجڈ نظر آتا ہے'' پتلون والی نے حقارت سے ہونٹ نکالے۔

''گاکی، کروڈ، ان کوتھ'' ٹوکرا بالوں والی دانت بھینچ کر بولی۔

''میرے بدن پر تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اسے دیکھ کر۔'' سی تھرو نے کہا۔

چوکیدار نے سونٹا باہر کھڑا کیا اور خود جلدی سے بوتھ میں داخل ہو گیا۔ اس نے ٹیلی فون کا چونگا اُٹھایا اور فون پر باتیں کرنے لگا۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے لیکن بات سنائی نہیں دے رہی تھی۔ چند ایک منٹ کے بعد وہ بوتھ سے باہر نکلا اور حسب معمول ہال کا چکر لگانے کے بجائے ہال کی طرف پیٹھ کر کے کھڑا ہو کر سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔

''ضرور کوئی ایمر جنسی ہے۔'' شکاری نے چھائے ہوئے سکوت کو توڑا۔

گیلری میں رومی ٹوپی والا ہنسا۔ ''ایمر جنسی۔۔۔یہ دور تو بذاتِ خود ایک سٹیٹ آف

ایمر جنسی ہے۔"

"ایک اُبال ہے۔ بے مقصد اُبال" لنگی والے نے قہقہہ لگایا۔

منی سکرٹ والی نے لمبی لمبی پلکیں جھپکا کر اوپر دیکھا۔

"اِگنور ہم مائی ڈِیَر"۔ موٹر سائیکل والے نے سائیلنسر فٹ کر کے کہا۔

"میں کہتا ہوں ضرور یہ کسی کے انتظار میں کھڑا ہے ضرور کوئی آنے والا ہے۔" سٹوڈنٹ زیرِ لب بولا۔

"چوکیدار کو دیکھ کر میری روح خشک ہو جاتی ہے۔" سی تھرو نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

لنگی والے نے مسکرا کر پوچھا۔ "بی بی کیا تیرے اندر روح بھی ہے، ہوتی تو تُو سی تھرو نہ ہوتی۔

"کتنی ڈراؤنی شکل ہے چوکیدار کی۔" پتلون والی، لنگی والے کے سوال کو دبانے کے لیے بولی۔

رومی ٹوپی والا ہنسنے لگا۔ "کتنی عجیب بات ہے اپنوں کو دیکھ کر ڈر کر سہم جاتی ہیں۔ بیگانوں کو دیکھ کر ایٹ ہوم محسوس کرتی ہیں۔"

"شپ اپ" پتلون والی ڈانٹ کر بولی۔۔۔ "یو۔۔۔ اَن کلچرڈ۔۔۔ اَن کوتھ۔۔۔ سیوج۔"

"ول سیڈ۔" بلیک سوٹ والے نے کہا۔ "ہیئر ہیئر۔۔۔ جنٹلمین چیئرز۔"

سارا ہال تالیوں کی آواز سے گونجنے لگا ہمارے دور میں اَن سویلائزڈ۔ ان ایجوکیٹڈ۔ لوگوں کو لب ہلانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی"۔ جیکٹ والا منہ سے جھاگ نکالتے ہوئے بولا۔

"تمہارا دور۔" مجنوں نُما ہنسا۔ "نقالوں کا دور، چربہ دور۔ یہ دور مغربی تہذیب کی کاپی ہے کاپی۔ بیگانوں کی طرز زندگی کی نقل کرو ان کے خیال کو اپناؤ۔ اپنوں سے، ملکوں سے نفرت کرو یہی نا۔"

''مغربی تہذیب مغرب میں خودکشی کر چکی ہے۔ چاند غروب ہو چکا ہے۔ اس کی آخری شعاعیں یہاں سرابی رنگ دکھا رہی ہیں۔'' ہپی مسکرایا۔ ''اور۔۔۔''

''میں کہتی ہوں''۔ پپن نے اس کی بات کاٹی۔ ''اگر نقل ہی کرنی ہے تو کسی ایسی قوم کی کرو جس میں جان ہے زندگی ہے۔ چربہ بننا ہے تو کسی ایسی تہذیب کا بنو جو اُبھر رہی ہے۔ کیوں ڈوبتے سورج کو پُوج رہے ہو۔''

جیکٹ والے نے اپنا قلم جیب میں اٹکایا عینک کو سنبھالا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرے اور ہال کے درمیان آ کر بولا۔ ''کون نہیں جانتا کہ کون سی قومیں اُبھر رہی ہیں۔''

مشہدی لنگی والا قہقہہ مار کر ہنسا۔ ''ذرا اس فیشن آرکیڈ پر نظر دوڑاؤ۔ کیا یہ رنگ ان قوموں کا ہے جن کا تم حوالہ دے رہے ہو۔''

''کیا یہ منی سکرٹ، یہ سی تھرو بی اس آئیڈیل کے مظہر ہیں جس کے تم دعویدار ہو کیا تمہارا دور جس پر تم اتنے نازاں ہو تمہارے مقاصد کی نشاندہی کرتا ہے۔'' رومی ٹوپی والا جوش میں بولا۔

''ابھی ہم جدوجہد کے عالم میں ہیں۔'' سٹوڈنٹ نے اپنے ٹوکرا بالوں کو جھٹک کر سنوارتے ہوئے کہا۔

مجنوں نما ہنسا۔ ''ذرا آئینہ دیکھو میاں کیا جدوجہد کرنے والوں کی شکلیں ایسی ہوتی ہیں جیسی تمہاری ہیں کیا ان کی قلمیں سارنگی نما ہوتی ہیں۔ کیا ان کے سروں پر بالوں کے ٹوکرے دھرے ہوتے ہیں کیا اُن کی آنکھوں میں سُرمے کی دھار ہوتی ہے کیا وہ ایسے بنے ٹھنے ہوتے ہیں جیسے تم ہو۔ تم نے تو لڑکیوں کو بھی مات کر دیا۔ ایمان سے۔۔۔

ہال پر خاموشی طاری ہو گئی۔

سب چُپ ہو گئے رومی ٹوپی والا ہنسنے لگا۔

کسی نے رومی ٹوپی والے کو جواب نہ دیا۔

''وہ دن کب آئے گا''۔ دُور سے یوں آواز سنائی دی جیسے کوئی آہیں بھر رہا ہو۔

''کون سا دن بی بی۔'' کُرتے پاجامے والے نے پوچھا۔

”جب مجھے ماماتا کے جذبے پر شرمندگی نہ ہوگی۔“ بچے کو انگلی لگائے کھڑی ماں بولی
”جب اس آرکیڈ میں سر اُٹھا کر کھڑی ہو سکوں گی۔“

”سچ کہتی ہو بی بی آج کے دور میں مائیں اپنے بچوں کو اپناتے ہوئے شرم محسوس کرتی ہیں۔“ رومی ٹوپی والے نے کہا۔

”وہ ماں کہلوانا نہیں چاہتیں۔“ کُرتے پاجامے والا بولا۔ ”بچوں سے کہتی ہیں۔ مجھے باجی کہہ کر بلاؤ۔“

”آج کی عورت، عورت بن کر جینا چاہتی ہے، ماں بن کر نہیں۔“ لنگی والا بولا۔

”میں پوچھتا ہوں کیا عورت کو عورت بن کر جینے کا حق نہیں۔ تم نے اسے ماں بنا کر قربانی کا بکرا بنا دیا تھا۔ ہم نے اسے عورت کی حیثیت سے جینے کا حق دیا ہے۔“ بلیک سوٹ نے کہا۔

”تمہیں کچھ پتہ بھی ہو۔“ رومی ٹوپی والا ہنس کر بولا۔ ”وہ سب تہذیبیں تباہ کر دی گئیں جنہوں نے ماماتا کو رد کر دیا تھا اور عورت کو عورت بن کر جینے کا حق دیا تھا۔ اس دنیا میں صرف وہی تہذیب پنپ سکتی ہے جو بچے کو زندگی کا مقصد مانے۔“

”پاگل ہیں یہ ماضی کے دیوانے، جیکٹ والے نے عینک اتار کر صاف کی۔ اتنا نہیں جانتے کہ آج سب سے بڑا معاشی مطالبہ یہ ہے کہ بچوں کی پیدائش کو روکا جائے۔“

”بالکل بالکل“۔ بلیک سوٹ والے نے ہاں میں ہاں ملائی۔

”بچے کم خوشحال گھرانہ۔“ موٹر بائیکل والا گنگنانے لگا۔

”سبحان اللہ۔“ مشہدی لنگی والا بولا ”سوشل ازم کے نام لیوا سرمایہ داروں کے حربے کا پرچار کر رہے ہیں۔“

”بھائی صاحب بچے تو غربت کی پیداوار ہیں قدرت کا اصول ہے جس گھر میں پیسے کی ریل پیل ہوگی بچے پیدا کرنے کی قوت کم ہو جائے گی۔ اگر غریبوں کی یہ صلاحیت ختم کر دی گئی تو تخلیق کا عمل مدھم پڑ جائے گا شاید ختم ہو جائے۔“ رومی ٹوپی والے نے کہا۔

”مئین پاور کی عظمت کو ماننے والے بچوں کی پیدائش کو معاشی رکاوٹ سمجھ رہے

ہیں۔'' مجنوں نما قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔

پُتلیاں ایک دوسری سے سرگوشیاں کرنے لگیں۔

''کیا کہہ رہا ہے یہ۔''

''گاڈ نوز۔''

''ہے۔ چلڈرن ہیونوسنس۔''

''سیانوں نے کہا تھا'' کرتا پاجامے والا کہنے لگا کہ۔۔۔

''کون سیانے۔'' جیکٹ والے نے پوچھا۔

''ہمارے لکتے لوگ'' کرتا پاجامے والے نے وضاحت کی کوشش کی۔

''تم اپنے۔ لکتوں کی بات کر رہے ہو'' لنگی والے نے اسے ٹوکا۔ انہیں سمجھ میں نہیں آئے گا۔ ان کے لکتے تو مغرب میں رہتے ہیں۔ یہ تو مغربی تہذیب کے دیوانے ہیں۔''

''وہ دن دور نہیں''۔ اچکن والے نے کہا۔ ''جب انہیں اپنے لکتوں کو اپنانا پڑے گا۔''

''بھول جاؤ وہ دن۔'' جیکٹ والا جلال میں بولا۔ ''وہ دن کبھی نہیں آئے گا۔''

''ہم ترقی کی جانب قدم اُٹھا رہے ہیں۔ ہم آگے بڑھنے کے قائل ہیں۔ ہم کبھی واپس ماضی کی طرف نہیں جائیں گے۔''

موٹر سائیکل والے نے لٹکے بالوں والی کی طرف دیکھا۔ ''کیوں ڈارلنگ۔''

''فارگٹ دیٹ ڈے۔ اٹ ول نیور کم۔'' لٹکے بالوں والی نے بال جھٹک کر کہا۔

گیلری کے کاٹھ کباڑ سے ایک پُتلا اُٹھ بیٹھا اس نے ایک لمبا چغہ پہن رکھا تھا، سر پر کُلاہ تھا۔ ''کون نہیں مانتا اس دن کو۔ کیا تمہیں نظر نہیں آ رہا کہ دُنیا کا نظام بدل رہا ہے۔''

''اچھا بدل رہا ہے کیا''۔ شکاری نے طنزاً کہا۔

سب پُتلے ہنسنے لگے۔

''دُنیا کے سارے مذہب سارے نجومی۔ سارے سیئرز آنے والے گولڈن ایج کو مانتے ہیں۔'' چغے والا چلاّیا۔

عیسائی، مسلمان، یہودی، ہندو سبھی مانتے ہیں۔ اسٹرالوجرز اس کی شہادت دیتے

ہیں۔'' رومی ٹوپی والے نے کہا۔

''وہ گولڈن ایج۔'' چغے والے نے انگلی اٹھا کر کہا۔ ''جب ترقی کا رُخ مادی سہولتوں سے ہٹ کر روحانی مقاصد کی طرف مڑ جائے گا۔ جب ہماری توجہ باہر کے آدمی کی جگہ اندر کے آدمی پر مرکوز ہو جائے گی۔ جب امن ہوگا۔ اطمینان کا دور دورہ ہوگا۔''

موٹر سائیکل والے نے طنز بھرا قہقہہ مارا۔

جیکٹ والے نے چلا کر کہا۔ ''ضعیف الاعتقادی نہیں خوش فہمی ہے یہ۔''

''اچھا''۔ ماں بولی۔ ''کیسا گولڈن ایج ہوگا وہ۔''

''نشاۃ ثانیہ۔'' چغے والا چلا کر بولا۔

''نشاۃ ثانیہ۔'' ہال کی دیواریں گونجنے لگیں۔

''دُنیا پر مبارک ترین ستاروں کا اکٹھ ہو رہا ہے۔ ایسا اکٹھ جو کبھی آج تک نہیں ہوا تھا۔''

چغے والا بولا۔

''اس کے اثرات ۱۹۸۰ء کے لگ بھگ ظہور میں آئیں گے۔''

ٹوکرا بالوں والی نے منہ میں انگلی ڈال لی ''سچ۔''

ساڑھی والی نے سینہ سنبھالا۔

سی تھرو کا رنگ اُڑ گیا۔

خاموش لٹکے بالوں والی چلائی۔ ''وہ دیکھو وہ۔'' اس نے انگلی سے باہر کی طرف اشارہ کیا۔ سب انگلی کی سیدھ میں پورٹیکو کی طرف دیکھنے لگے۔

''کیا ہوا'' دور سے پولکا بکس کے قریب کھڑی پتلون والی نے پوچھا۔

''کیا بات ہے؟''

''پتا نہیں۔''

''کون ہے؟''

دُور کھڑی پُتلیاں سرگوشیاں کرنے لگیں۔

موٹر سائیکل والے نے اپنا سائیلنسر فٹ کر کے کہا۔ ''وہ آ رہے ہیں، خاموش۔'' اس نے دور کھڑے پُتلوں کو خبردار کیا۔ ''وہ آ رہے ہیں۔ ادھر آ رہے ہیں۔''

''ہاں ہاں'' لٹکے بالوں والی بولی۔ ''انتظامیہ کے لوگ آ رہے ہیں۔''

''بالکل''۔ ساڑھی والی نے کہا۔ ''وہ ضرور اندر آئیں گے۔''

جیکٹ والے نے اپنی عینک صاف کی۔ اسے پھر سے لگایا اور پھر تحکمانہ لہجے میں بولا۔ ''سب اپنے اپنے مقام پر اپنا مخصوص پوز بنا کر کھڑے ہو جاؤ یقیناً کوئی ایمرجنسی ہے'' موٹر سائیکل والا بولا۔ ''ورنہ اس وقت ناظم کا یہاں آنا۔۔۔''

سارے پُتلے اپنی اپنی جگہ کھڑے ہونے کے لیے دوڑے۔

گیلری میں کھڑے پُتلے کونوں میں جا کر ڈھیر ہو گئے۔

ہال پر سناٹا طاری ہو گیا۔

آرکیڈ کا صدر دروازہ کھلا۔ ناظم اندر داخل ہوا اس کے پیچھے نائب تھا۔ نائب کے پیچھے دس بارہ کاری گر تھے۔ انہوں نے پینٹ کے بڑے بڑے ڈبے اور برش اٹھائے ہوئے تھے۔

ناظم کرسی پر بیٹھ گیا۔ نائب اور کاریگر اس کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ''دیکھو اس وقت تین بجے ہیں۔'' ناظم نے گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''ہمارے پاس صرف چھ گھنٹے ہیں۔ حکومت کے معزز مہمان جو دنیائے اسلام کے بہت بڑے سربراہ ہیں ٹھیک ساڑھے نو بجے آرکیڈ دیکھنے کے لیے آ رہے ہیں۔ ان کے آنے سے آدھ گھنٹہ پہلے سارا کام مکمل ہو جانا چاہیے سمجھے۔'' ناظم نے نائب سے مخاطب ہو کر کہا۔

''یس سر'' نائب نے جواب دیا۔ ''اٹ شیل بی ڈن۔''

''ہوں۔'' ناظم نے کہا۔ ''ہمارے پرائم منسٹر صاحب کا کہنا ہے کہ معزز مہمان توقع رکھتے ہیں کہ پاکستان کا سب سے بڑا شاپنگ سنٹر پاکستانی رنگ میں رنگا ہوگا اور پاکستانی زندگی، دستکاری اور فن کا مظہر ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ آرکیڈ کی ہر تفصیل پاکستانی ہو۔ سمجھے۔''

''آپ فکر نہ کریں۔۔۔۔سر''۔۔۔نائب نے کہا۔

پھر وہ کاریگروں سے مخاطب ہوا۔''دیکھو بھئی اتنے تھوڑے وقت میں، اتنے شارٹ نوٹس پر ہم نیا سامان مہیا نہیں کر سکتے۔اس لیے اسی سامان کو رنگ و روغن کر کے گذارہ کرنا ہو گا۔''

''جی صاحب'' کاریگروں نے جواب دیا۔

اگلے روز ساڑھے نو بجے جب معزز مہمان آرکیڈ میں داخل ہوئے تو صدر دروازے کے اوپر فیشن آرکیڈ کی جگہ پاکستان آرکیڈ کا بورڈ لگا ہوا تھا۔اندر دروازے کے عین سامنے اچکن والا بڑے طمطراق سے کھڑا تھا اس کے پاس ہی دائیں طرف رومی ٹوپی والا اپنا پھندنا جھلا رہا تھا۔بائیں طرف طرّہ باز مونچھ کو تاؤ دے رہا تھا۔قریب ہی بچے کو اُنگلی لگائے چادر میں لپٹی ہوئی خاتون بچے کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی اس کے پرے کُرتے پاجامے والا چھاتی پھلائے اِستادہ تھا۔

ساڑھی والی لمبا چغہ لٹکائے نگاہیں جھکائے لجا رہی تھی۔

سی تھرو چھینٹ کا گھگھرا پہنے سر پر پانی کی گاگر رکھے قدم اٹھائے کھڑی تھی۔

سکرٹ والی چست پاجامہ پہنے بازو پر جدید لمبا کوٹ اُٹھائے مسکرا رہی تھی۔

-☆-

ڈائری

۱۲ ستمبر

توبہ کتنی بوریت ہے اس گھر میں۔ کچھ ہوتا ہی نہیں یہاں بس روٹین ہی روٹین ہے۔ سامنے بنی بجی تصویر ٹنگی ہے۔ ڈیکوریشن پیس کو کوئی کب تک دیکھتا رہے۔

وہ تو شکر ہے سنبل نے مجھے لونِ لب دکھا دی جہاں سے مڈل ٹن کی بکس مل جاتی ہیں ہے کتنی رومانٹک سیریز ہے۔ لفظ بدن کے بند بند میں گھس جاتے ہیں۔ جگہ جگہ ٹکس بجتی ہیں، پھرکیاں چلتی ہیں، سکرو گھومتے ہیں، مینڈک پھدکتے ہیں۔ مزا تو آتا ہے پر فائدہ ساتھ ہی پینز شروع ہو جاتی ہیں۔ میں تو کتاب ایک طرف رکھ دیتی ہوں پڑھوں کہ بیتوں۔

بھائی کہتے ہیں، بکس ذہن کو روشن کرتی ہیں۔ جھوٹ میرے جسم کو تو جھنجھوڑتی ہیں۔

لو ممی آ گئی۔ توبہ کتنی بنی ٹھنی ہے۔ جیسے فرنی کی پلیٹ پر ورق لگے ہوں۔ ہر وقت خود کو سجاتی رہتی ہے۔ ورق لگاتی رہتی ہے۔ چاہے جتنے ورق لگا لے۔ اندر سے تو وہی ہے ناپچ پچ، ایسے لگتا ہے جیسے ممی کا جسم انتقام لے رہا ہے۔ جتنا سمیٹتی ہے، اتنا پھوٹ پھوٹ کر نکلتا ہے۔ پتہ نہیں کس وجہ سے انتقام لے رہا ہے۔ زیادتیاں کی ہوں گی۔ ہوں گی کا مطلب، اب بھی کر رہی ہے۔ ورق جو لگ رہے ہیں۔ ہٹاؤ۔ مجھے کیا لینا دینا۔

لو فون بجنے لگا۔

کہیں میر الیٹسٹ رانگ نمبر تو نہیں۔

رانگ نمبر بھی کیا چیز ہے۔ مزے کی ہابی ہے وقت اچھا کٹتا ہے۔ جب میں رانگ نمبر کو چھیڑتی ہوں تو وہ جھنجھنے کی طرح بجتا ہے۔ لائن پر آواز آتی ہے۔ جھن جھن جھن، مزے

کی بات یہ ہے کہ رانگ نمبر کو جو چاہے کہہ دو، چاہے رعب جھاڑو، چاہے گھورو، چاہے پیار کی بات کہہ دو، نہ گھبراہٹ نہ جھجک بس کچھ لوگ چِپ باتیں کرنے لگتے ہیں۔ پھر میں بند کر دیتی ہوں۔

لو یہ تو ممی بول رہی ہے فون پر، ڈارلنگ ڈارلنگ کیے جا رہی ہے۔ ڈیڈ کا ہوگا۔

ڈیڈی بے چارے تو اس گھر میں پے انگ گیسٹ ہیں۔ گھر والی لینڈ لیڈی تو ممی ہے۔

ممی ڈیڈی جتنا ایک دوسرے کو ڈارلنگ کرتے ہیں سمجھ لو اتنا ہی ایک دوسرے سے دُور ہوئے جاتے ہیں۔ ڈیڈی تو ریٹائر ہوئے بیٹھے ہیں۔ ممی نہیں ہوتی ریٹائر۔ کبھی نہیں ہوگی۔ پستے بادام ہی لگتے رہیں گے۔

۱۴ ستمبر

اُوں ہُوں اپنا کوئی چانس نہیں۔

پتہ نہیں کیا بات ہے۔ قریب جاتا ہوں تو سب چُپ ہو جاتی ہیں۔ قُلفی جم جاتی ہے۔ دوسروں سے گپیں مارتی ہیں۔ ہنستی ہیں، کھیلتی ہیں۔ ساتھ گھومتی پھرتی ہیں۔

بس کلاس کے سات آٹھ لڑکے ہیں جن کے ساتھ میل جول ہے۔ پتہ نہیں ان میں کیا ہے۔ مجھے تو کچھ بھی نہیں دِکھتا۔ ذرا بنے سجے ہوتے ہیں۔ انداز مخملی، روغنی پُتلے لگتے ہیں۔

کلاس میں لڑکیاں ہیں تو سات، پر مجھے تو دو اچھی لگتی ہیں۔ ایک تو نک چڑھی سُنبل ہے اور دُوسری ٹپ ٹپ مومی،

نک چڑھی تو بالکل فیوڈل لگتی ہے۔ ڈگنٹی ہی ڈگنٹی۔ ڈگنٹی کے تھال نیچے اوپر رکھے ہیں۔ جیسے حلوائی کی دکان پر لگے ہوتے ہیں۔

نک چڑھی سے تو بات کرنی مشکل ہے کسی سے لفتی ہی نہیں۔ ہر وقت تیوری چڑھائے رہتی ہے۔ لیکن جب مسکراہٹ پھوٹے تو پھلجھڑیاں چلتی ہیں۔ ہاں۔

پھر وہ ٹپ ٹپ ہے کیا نام رکھا ہے لڑکوں نے۔ ٹپ ٹپ، نام رکھنے میں تو لڑکوں کا جواب نہیں۔ نک چڑھی، ٹپ ٹپ، دلہن، چٹکی، لونڈا، نخرہ، ڈول، ٹپ ٹپ تو ٹپا ٹپ چلتی

ہے۔ لٹکے بال، موٹی جین یہ جاوہ جا، دوڑتی زیادہ ہے چلتی کم کم، بات میٹر آف فیکٹ۔

پروفیسر نے مذاق سے کہا آج تو غضب کی لگ رہی ہو۔ بولی روز ہی لگتی ہوں۔ کوئی نئی بات کیجیے سر، اور یجنل۔

بس ان دونوں میں سے ایک کے ساتھ دوستی ہو جائے اپنی حیثیت بن جائے اور پھر گڈ ٹائم مزہ آ جائے۔

ارے یہ تو چاچی آ گئی۔ سلام کہتا ہوں چاچی۔

ایک تو محلے بازی نے زچ کر رکھا ہے۔ یہ چاچا ہے، وہ ماما ہے۔ یہ پھوپھی ہے۔ وہ تائی ہے۔ سلام کرتے کرتے بور ہو جاتا ہوں۔

پھر یہ گھر، اُف یہ گھر، یہ نہ کرو۔ اُدھر نہ جاؤ، اِدھر نہ جاؤ، سب محلہ داری کے جھمیلے، ہٹاؤ اب اس جھوٹی وضع داری کو، بہت ہو لی۔ امی صرف داری نہ کرے تو اپنا بھانڈا پھوٹ جائے۔ ابا کے تو اصول ہی دم لینے نہیں دیتے گھر میں رہنا اک عذاب ہے۔

چھٹی کا دن بھی نہ آئے۔۔۔ بوریت، بوریت، بوریت

۲۰ ستمبر

توبہ، یہ سر تو جونک کی طرح چپک جاتا ہے۔ پاس آئے تو لیس نکلنی شروع ہو جاتی ہے تاریں ہی تاریں۔

پتہ نہیں کیا سمجھتا ہے خود کو، تربوز سا سر ہے، ٹانٹ چمکتی ہے۔ جیسے تیل چپڑ رکھا ہو، اِدھر اُدھر بالوں کے گچھے لٹکتے ہیں۔ کارٹون لگتا ہے۔

ہمارے سر جو ہیں، بس چار ایک پریذنٹ ایبل ہیں باقی سب لنڈے سے آئے ہیں۔ وہ جو اکنامکس کا ہے نا وہ تو بالکل فلمی ہیرو لگتا ہے میک اپ کر کے آتا ہے۔ جیسے بیوٹیک سے نکلا ہو۔

مجھے نہیں اچھے لگتے بنے ٹھنے لوگ، وہ لڑکے جو لڑکیوں کے آگے پیچھے پھرتے ہیں وہ تو سارے روغنی ہیں، گھسی پٹی باتیں کرتے ہیں؟ ہاؤ ڈی سنبل پلیز میں ثریا بیسٹلی ویدر۔

ہمارے اسکارٹ بنے پھرتے ہیں۔ دروازے کھولتے ہیں۔ کوٹ اٹھاتے ہیں۔

رومال بچھاتے ہیں۔ کیئر اور کنسرن سے بھیگے رہتے ہیں۔ ہم کیا موتی چور کے لڈو ہیں یا کریم پفس۔

باقی لڑکے تو کراوڈ ہیں۔ کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔ اکٹھے ہوں تو مانسٹر بن جاتے ہیں۔ اکیلے وکیلے سر لٹکائے پھرتے ہیں۔ آنکھ ملانے کی ہمت نہیں پڑتی۔ پرانے زمانے کی لڑکیوں کی طرح بلش کرتے ہیں۔ ویسے جی چاہتا ہے۔ حوصلہ نہیں پڑتا۔

بھڑک کر جلنے والے بھی ہیں۔ اُنگلیوں پر گن لو۔ بس اتنے ہی۔ گلیڈ آئی چمکاتے ہیں۔ سمائل پھینکتے ہیں۔ بات بھی کر لیتے ہیں۔ اُکھڑی اُکھڑی، سر کو کہیں دیکھا ہے۔ پیریڈ شروع ہو گیا۔ کل چھٹی ہے کیا، سب بہانے، بات کرتے وقت نگاہوں کی پھلجھڑیاں بھی چلاتے ہیں۔ لیکن آگے بڑھنے کی ہمت نہیں پڑتی۔

لو کراوڈ ہڑبونگ مچانے لگا۔ جب ہڑبونگ مچاتا ہے تو جوبن پر آ جاتا ہے۔ لٹکی گردنیں جیک ان دی باکس کی طرح ڈبے سے نکلتی ہیں۔ سینے تن جاتے ہیں۔ بے زبانوں کو زبان مل جاتی ہے۔۔۔ مجھے اچھا لگتا ہے۔ شور شرابا ہو، ہنگامہ ہو، کچھ ہو، ہوتا رہے۔

ارے یہ تو کسی سیاسی اِشو پر ہنگامہ ہے۔ انہیں تو ہنگامے سے دلچسپی ہے۔ اِشو کی سمجھ نہیں۔ سیاست تو بہانہ ہے۔ شوراشوری پر مرتے ہیں۔ یہی ان کی پالیٹکس ہے۔

وہ سامنے جو نعرہ بازی کر رہا ہے۔ کتنی رف نس ہے اس میں رف ہے۔ بائیٹ ہے ذرا بھی ڈرائنگ رومش نہیں اس میں۔ مجھے رف نس پسند ہے۔ بولڈ ہو، رف ہو، بائش ہو۔

لو اب نعرے گونجنے لگے۔ سب تماشہ ہے، تماش بینی ہے۔ اور بس،

یونیورسٹی انہیں سیریس لے لیتی ہے۔ امپارٹنس دیتی ہے خوانخواہ وہ سمجھتی ہے یہ پالیٹکس ہے۔ ان کا جلوس دیکھ کر تھر تھر کانپتی ہے۔ پتہ نہیں کیا ہوگا۔۔۔ کچھ بھی نہیں ہوگا۔ بس ہلا گُلا ہوگا۔ دس ایک شیشے ٹوٹیں گے۔ چار ایک کرسیاں، پھر ٹھنڈے پڑ جائیں گے۔ جتنی جلدی گرم ہوتے ہیں، اتنی جلدی ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔

میں تو کہتی ہوں سب سرز کو کراوڈ سائیکالوجی پڑھ کر آنا چاہیے یونیورسٹی میں۔ ارے یہ تو اینڈی آ رہا ہے۔

آتے ہی کہے گا چلو ٹک شاپ چلیں۔ آئی ایم سو ہنگری، بھوک وھوک کوئی نہیں ہوتی۔ مطلب ہے بہانے بہانے لڑکیوں کو ٹریٹ کرے۔ پتہ نہیں کیا سمجھتا ہے یہ کہ کوک پلا پلا کر پھنسا لے گا۔ ایڈیٹ۔ چلو جو مرضی ہے سمجھے میں تو کوک پینے چلی۔ مفت کی کون چھوڑے۔

۲۴ ستمبر

کیا کر رہی ہے یہ خالہ کی بیٹی فرحتو، خوامخواہ آنکھیں مٹکائے جا رہی ہے۔ ہنستی چلی جا رہی ہے۔ ویسے تو چھوٹے اجّی سے کھیل رہی ہے۔ پر اجّی تو بہانہ ہے۔ سب کچھ میرے لیے ہو رہا ہے۔ اٹریکٹ کرنے کے کیا کیا گر ہوتے ہیں۔ بات اجّی سے کرتی ہے سُناتی مجھے ہے آنکھیں اس سے لڑاتی ہے، دکھاتی مجھے ہے۔ منہ اس کا چومتی ہے۔ بُجھاتی مجھے ہے یہ ڈھنگ پُرانے ہو گئے۔ اب نہیں چلتے۔ اپیل نہیں رہی۔ یونیورسٹی میں جانے سے پہلے یہی نخرے کتنے اچھے لگتے تھے مجھے۔ ان دنوں پھوپھی کی بیٹی رضو یہی کچھ کیا کرتی تھی۔ پڑوسی کے بچے کو آ جا، آ جا کرتی پھر میری طرف دیکھتی سمجھے کیا سمجھے۔

میرا تو بُرا حال ہو جاتا تھا۔ شوربہ چُو جاتا تھا اپنا۔۔۔ لیکن اب کچھ بھی نہیں ہوتا۔ فرحتو پر ترس ضرور آتا ہے۔

آج کل یہ سب کچھ نہیں چلتا۔ آج کل تو ورکنگ وومن چلتی ہے۔ جین چڑھا لیتی ہے۔ بیگ لٹکا لیتی ہے۔ اور پھر ٹپ ٹاٹپ، یہ جا وہ جا، ایسی سمارٹنس کی اپیل دیتی ہے کہ دل دھک سے رہ جاتا ہے جو بال نہ لٹک رہے ہوں تو پتہ ہی نہ چلے کہ لڑکی ہے۔

اپنی کلاس کی ٹپ ٹپ جو ہے۔ واہ کیا ٹپ ٹپ ہے۔ یہ آئی وہ گئی۔ ہے بڑے گھر کی پر عوامی بنی پھرتی ہے۔ کچھ بھی کر لو سالی نوٹس ہی نہیں لیتی۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈالو پڑے ڈالو۔ رجسٹر ہی نہیں کرتی۔ سمائیل پھینکو پہنچتی ہی نہیں۔ کیسے پہنچے پہنچتی ہے تو وہ چھ قدم آگے جا چکی ہوتی ہے۔ کر لو بات۔

بات بھی کر دیکھی۔ چار ایک بار، پر بات بنی نہیں میٹر آف فیکٹ جواب دیا اور وہ گئی، نہ جھینپتی ہے، نہ بنتی ہے، نہ جھجکتی ہے۔

بھئی بات تو ایک بہانہ ہوتی ہے کہ بات سے بات نکلے۔ اس لیے تو نہیں کی جاتی کہ جواب مل جائے۔ انفرمیشن حاصل ہو۔

اور وہ نک چڑھی سنبل وہ تو کار والوں کی گاہک ہے ہم بات کریں تو ناک پکوڑا بن جاتی ہے۔

آج کل ساری لڑکیاں ہی سٹیٹس سیکرز ہیں پہلے لڑکے کو تولتی ہیں بنگلہ ہے؟ کار ہے؟ انٹر کان لے جائے گا۔ پھر بات کرتی ہیں۔ رومان کا دور گیا۔ اب نہیں چلتے رومانس اب تو افیئرز چلتے ہیں۔ بڑی کیلکولیٹنگ ہو گئی ہیں لڑکیاں ظفر میاں۔۔۔ اپنا کوئی چانس نہیں کیا مصیبت ہے۔ جہاں چانس ہی چانس ہے۔ وہاں دل نہیں مانتا جہاں نہیں وہاں مچل جاتا ہے۔

یہ فرحتو ہی دیکھ لو۔ سجی سجائی پلیٹ دھری ہے۔ سامنے اور میں۔ میں بھی ایڈیٹ ہوں، ایڈیٹ۔

• یکم اکتوبر

آج تو حد ہو گئی۔

وہ رانگ نمبر بول پڑا۔

ایک مہینے سے چپ چپ تھا۔

میں ریسیور اٹھا کر ہیلو کہتی تھی تو آگے سے بولتا ہی نہ تھا۔ بس فون کان سے لگائے رہتا۔ میں سمجھتی رہی۔ میری آواز سننا چاہتا ہے ایک دن میں نے کہا پتہ لکھوا دو تو اپنی آواز ریکارڈ کر کے ٹیپ بھیج دوں۔ یوں کب تک بولتی جاؤں۔

کتاب اُٹھا کر کوئی ریسی ٹیشن سناؤں۔ غزل سنو گے یا نظم، انگریزی یا اُردو، پھر میں نے اسے ایک نظم سنائی بھی تھی۔ 'سویرے جو کل آنکھ میری کھلی' آرام سے سنتا رہا۔ کمبخت ہنستا بھی تو نہیں۔ میں نے بیسیوں باتیں کیں۔ گونگے ہو۔ ڈرتے ہو۔ بات کرنی نہیں آتی۔ عشق تو نہیں ہو گیا۔ تنگ آ گئی۔ میں چھوڑ دیتی پر کیوریاسٹی دیمک کی طرح لگی تھی کہ ہے کون۔ اتنا پیشنس، چپ کیوں لگی ہے۔ چپ، دل لگی تو ہو نہیں سکتی۔ پردہ ہو سکتی ہے کس

بات کا پردہ،

آج بولا تو پتہ چل گیا۔ اپنی عمر پر پردہ ڈال رہا تھا۔ کتنا مس انفارمڈ ہے۔ بھلا آج کل عمر شرمانے کی چیز ہے کیا، اولڈا یج تو فیشن میں ہے۔

لڑکیاں تاک میں بیٹھی ہیں کہ ایجڈ مل جائے۔ بنگلہ ہوگا۔ کار ہوگی سٹیٹس ہوگا۔ اور پھر سپائل تو ایجڈ ہی کرتے ہیں۔ راج تو ایجڈ پر ہی کیا جا سکتا ہے۔ دل اسٹبلشڈ ہوتے ہیں نا۔

رہی کمپینین شپ، جی تو چاہتا ہے کہ کمپینین شپ ہو۔ ہاتھ میں ہاتھ پکڑ کر آوارہ گردی کروں۔ پر خالی خولی کمپینین شپ کو کوئی چاٹے گا۔ وہ یوسف زلیخا کا زمانہ گیا۔ دل کے پیچھے چل کر کھجل ہونے والی بات ہے۔ ایجڈ ساتھ سب کچھ لاتا ہے۔ کمفرٹس، بے فکری، کپڑا لتا لگژری، کیا نہیں لاتا۔

بس ایک خطرہ ہوتا ہے۔

ایجڈ ذرا شکی مزاج کے ہوتے ہیں۔ بات بات پر جیلس ہو جاتے ہیں۔ یا اتنے لیس دار ہوتے ہیں کہ ہر وقت ساتھ چپکے رہتے ہیں۔ ایسوں سے اللہ بچائے۔

کلچرڈ ہو تو سب اچھا آئی مین لارج ہارٹڈ۔

تھوڑی سی سکولنگ کرنی پڑتی ہے۔ پھر چاہے ساتھ افیئر بھی چلا لو۔ جو یہ سہہ جائے تو موج ہو گئی۔ پھر سب کچھ سہہ جائے گا۔

سُنبل تو مرتی ہے کہ ایجڈ پھنس جائے۔ ہے سلی گوز، بات کہہ دیتی ہے۔ اتنا نہیں سمجھتی کہ لڑکیوں میں بڑا ہارڈ کمپی ٹیشن ہے۔ دور سے دیکھو تو لگتا ہے ہاتھ کی انگلیوں کی طرح ساری ایک ہیں، اندر سے سب چھریاں نکالے بیٹھی ہیں۔

پرانے دور میں مردوں میں کمپی ٹیشن ہوا کرتا تھا۔ لڑکیاں زیادہ نہیں ہوتی تھیں نا۔ اب ایجوکیٹڈ لڑکیاں زیادہ ہیں۔ سٹیٹس والے لڑکے کم کم، جبھی تو چھینا جھپٹی لگی رہتی ہے اپنے بوائے فرینڈ کو ہوا نہیں لگنے دیتیں۔ سمجھ لو ایک میڈ ریس چل رہی ہے۔

وہ سنبل سمجھتی ہے میں ایک ورکنگ وومن ہوں اس لیے کمپی ٹیشن میں شامل نہیں۔ نن کم پوپ۔

مجھے تو سنبل پر ترس آتا ہے۔ اتنا نہیں سمجھتی کہ بیگمات کا زمانہ گیا۔ فیوڈل میں اپیل نہیں رہی۔ آج کل تو ورکنگ وومن چلتی ہے۔ بھئی عوامی دور ہے۔ پر یہ مطلب نہیں کہ دل سے عوامی بن جاؤ، اُوں ہُوں صرف دِکھو۔

میں بھی تو عوامی دکھتی ہوں۔ تھیلا لٹکا لیتی ہوں۔ ٹپ ٹپ چلتی ہوں۔ عوامی بن جاؤ تو ایکشن کی رینج بڑھ جاتی ہے۔ وائڈری ایکشن ہوتا ہے۔ عام بھی متوجہ ہوتے ہیں خواص بھی۔ کراوڈ تو منہ اُٹھا کر دیکھتا ہے۔

بس ایک ہی کاشن ہے۔ دوسرے دیکھیں۔ خود نہ دیکھو۔ بے شک دکھاؤ پر پتہ نہ چلے کہ دکھا رہی ہو۔ دوسرے مسکرائیں خود سیریس رہو۔ دوسرے آوازے کسیں۔ نوٹس نہ لو، کوئی بات کرے، چیپ ہو، کراوڈ ہو، رومانٹک ہو، آبسین ہو، شاکنگ ہو۔ کیسی بھی ہو۔ پڑا کرے۔ میٹر آف فیکٹ جواب دو۔ یوں جیسے رجسٹر ہی نہ کی ہو۔ بس شروع میں دِقت ہوتی ہے۔ پھر چل نکلتی ہے۔

لورانگ نمبر پھر بولا۔

کوئی ایسی بات کروں کہ انوائٹ کرلے۔ دیکھوں تو کیسا ہے۔ کیسا بھی ہو۔ مائینڈ نہیں کرتی۔ پر دیکھوں، سمجھ جانے والا ہے کہ نہیں۔

۱۸، اکتوبر

کل تو حد ہوگئی۔ کمال کر دیا پنھی نے۔ یقین نہیں آتا۔ ابھی تک نہیں آیا۔

خالد سے بازی لگی تھی۔ شرط بدھی تھی۔ جو ہارے کارن سوپ کھلائے۔ کارن سوپ بہت پسند ہے مجھے، بڑا مہنگا بیچتے ہیں۔ ورنہ روز کھاؤں خالد ہار گیا۔ بولا آج شام کو چھ بجے وانگ چو، میں نے کہا اوکے۔

مگر غچہ دے گیا۔ پہنچا نہیں۔ اچھا ہی ہوا کہ غچہ دے گیا۔ پہلے تو میں باہر انتظار کرتا رہا پھر سوچا چلو آیا ہوں تو ایک کوک ہی پیتا چلوں۔

اندر داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ٹپ ٹپ بیٹھی ہے۔ ساتھ کوئی تھا۔ انکل قسم کی چیز، سوچا چلو میز کے پاس سے گزر رو۔ ہلکی سی وِش کرتے چلو۔

وِش کی تو بولی، ہیلو

میرا خیال تھا منہ پھیر لے گی یا زیادہ سے زیادہ ہلکی سی مسکراہٹ۔

مومی نے ہیلو کہا تو انکل اٹھ بیٹھا ہاتھ بڑھا دیا۔ فاروقی، ہم نے بھی دبا کر ہاتھ ملایا۔

ظفر۔ وہ بولی۔ مائی کلاس فیلو۔

اس پر انکل بولا۔ اِف یو لائیک ٹو جائن اَس۔ اندھے کو کیا چاہئے۔ ڈٹ کر بیٹھ گیا۔

پھر کیا تھا وہ اس سے باتیں کرتی رہی وہ مجھ سے بات کرتا رہا اور کارن سوپ مفت کارن سوپ کیا۔ سویٹ اینڈ ساور، بیف اینڈ چلیز اور پتہ نہیں کیا کیا۔ کبھی کھائے ہوں تو نام جانوں۔

بس بھئی آج کچھ اور سوجھتا ہی نہیں۔

یوں بیٹھا ہوں جیسے چوہے نے بھنگ پی رکھی ہو۔

۱۰ دسمبر

حد ہوگئی۔ یہ فاروقی دِکھتا کیا نکلا کیا۔ اوپر سے اتنا ڈرائنگ روم شی تھا۔ گڈ ٹائمنر دکھتا تھا۔ اندر سے اتنا سیریس مائینڈڈ، اتنا سنگل ٹریک، وہ تو مرمٹا ہے کہتا ہے ایک سال سے پیچھا کر رہا تھا۔ کہتا ہے شادی کرلو ابھی ابھی اسی وقت، جلدی۔

صاف دِکھتا ہے۔ جو کہوں گی مانے گا۔ سب کچھ سہہ جائے گا۔ سب کچھ۔

اُوں ہُوں، جیلس ٹائپ نہیں، الٹا ٹالرینٹ ہے عجیب کمبی نیشن ہے۔ خوش مزاج ہے، افکشینیٹ ہے۔ ایج کامپلکس ہے۔ یہ بات تو اپنے حق میں ہے نا۔ قائم ہی رہے تو اچھا۔ لے کے رہیں گے والی ضد ہے۔ آوے ہی آوے قسم کا کانفی ڈنس بھی ہے۔ تھوڑی سی توجہ ضرور مانگتا ہے۔ ساری نہیں تھوڑی سی۔

میں بھی کیسی احمق ہوں۔ سوچ رہی تھی جو سوٹ نہ کیا تو پلیٹ پر رکھ کر سنبل کو پیش کر دوں گی۔

یہاں تو بات ہی اور نکلی۔ یہ تو میرا دیوانہ نکلا، پرسنل۔ سوٹ تو کرتا ہے۔ پتہ نہیں گھبراہٹ سی کیوں محسوس ہو رہی ہے۔ ڈیسیین نہیں کر پائی اور وہ ظفر۔۔۔ بالکل ہی گرین

یوتھ نکلا اتنا کچا۔ پہلے تو فاروقی کو انکل سمجھتا رہا۔ ایڈیٹ اسے سر سر کرتا رہا۔ فاروکو تو پسینہ آ جاتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ عمر کی دیوار ٹوٹے یہ سر سر کر کے کھڑی کیے جا رہا تھا۔ پہلی ملاقاتوں میں تو بڑی رڈیکولس پوزیشن رہی پھر سمجھ گیا۔ ہے تیز، بڑا بولڈ ہے۔ اب اسے یار یار کرنے لگا ہے۔ فارو بڑا خوش ہے اس پر، سچ مچ ظفر کو یار بنا بیٹھا ہے۔

مجھے نہیں پتہ تھا کہ ظفر اتنا کلرفل ہے۔ میں سمجھتی تھی اکھڑا، اکھڑا رہے گا۔ وہ تو گھل مل گیا۔۔۔ کیا نہیں اس میں سبھی کچھ ہے۔ رف نس ہے۔ بے تکلفی ہے۔ ڈیرنگ ہے۔ گڈ ٹاکر ہے انٹیلی جنٹ ہے۔ آنکھیں بڑی مرچیلی ہیں۔ تین سیکنڈ دیکھ لے تو سی سی کرنے لگو۔ ساتھی تو بہت ہی اچھا ہے۔ انگلی پکڑے پھرو۔ لیکن ہے جذباتی ڈر لگا رہتا ہے کہ دھرنا مار کر نہ بیٹھ جائے۔

کل سینما ہال میں فاروقی میرا ہاتھ پکڑ کر بیٹھا رہا۔ کتنی چائلڈش بات ہے۔ خالی ہاتھ پکڑ کر بیٹھے رہنا اور پھر یوں جیسے خزانہ مل گیا ہو۔

میں سمجھی کچھ کرے گا دبائے گا۔ جھٹکے گا۔ مروڑے گا یا شاید۔۔۔ لیکن خالی پکڑ کر بیٹھا رہا۔ میرا جی چاہا دوسرا ہاتھ ظفر کو تھما دوں۔ شکر ہے میں نے پکڑایا نہیں۔ ورنہ دو دن کے لیے ٹکور کرنی پڑتی۔ نہ نہ نہ ظفر کو اینکریج نہیں کرنا۔۔۔ ابھی نہیں۔ مس انڈرسٹینڈ کرلے گا۔ پتہ نہیں کیا سمجھ لے سب گڑبڑ ہو جائے گا۔

ویسے ساتھی کتنا اچھا ہے۔ اچھا کیا، اعلیٰ، ہاتھ پکڑا دو ملکوں ملک گھومو پھرو، زمین پر سوؤ، کھنڈروں میں رہو۔ ایڈونچر ہی ایڈونچر۔

اب اپنی پرابلم تو صرف یہ ہے کہ کیا کروں۔ کیا فاروقی کا پروپوزل مان لوں۔ ابھی سے آباد ہو جاؤں یا کچھ دیر اور ٹپاٹپ نہ کرلوں۔

بس صرف ڈیسی ژن کرنے کی بات ہے۔ پھر نو پرابلم، امّی تو سن کر خوشی سے ناچے گی۔ اسے تو بس ایک ہی ڈر لگا ہے کہیں میں دل کے ہاتھوں مجبور نہ ہو جاؤں رومانٹک رشتہ کرنے پر نہ مچل جاؤں۔ جانتی ہے نا کہ میں ضدی ہوں اُڑ گئی تو اَڑ گئی۔

ممی کو فاروق کا پتہ چلا تو ناچنے لگے گی خوشی سے۔ کیوں نہ ناچے۔ ممی کو مزید سٹیٹس مل

جائے گا۔

ملاقات کا حلقہ وسیع ہو جائے گا۔ نئے کان ٹیکٹ۔ رہے ڈیڈی تو وہ میٹر ہی نہیں کرتے۔ حیرت سے سر اٹھائیں گے۔ ممی کے تیور دیکھیں گے اور پھر جھکالیں گے۔

مجھے ایسے لگتا ہے جیسے ڈیڈی اب سوشل لائف کو فیوٹائل سمجھنے لگے ہیں۔ فرسٹریشن محسوس کرتے ہیں۔ سارا قصور ممی کا ہے ممی تھوڑی توجہ دے تو ٹھیک ہو جائیں۔ ممی توجہ کیسے دے وہ تو خود توجہ طلبی کا شکار ہے۔ پستے بادام ایسے تو نہیں لگتے رہتے۔

لو ممی آ گئی۔

ارے یہ کیا سیدھی میری طرف کیوں آ رہی ہے۔ آج بات کیا ہے۔ روز تو۔۔۔ سیدھی میک اپ ٹیبل کی طرف جایا کرتی ہے۔

ہائیں۔۔۔ اتنی بیمنگ نگاہ سے دیکھ رہی ہے مجھے۔ ضرور کوئی بات ہے۔۔۔ اوہو ضرور اسے فاروقی کا پتہ چل گیا ہے۔ اُوں ہُوں۔

بات نکل گئی۔

چلو اچھا ہوا۔ فیصلہ کرنے کی مصیبت سے جان چھوٹی چل مومی، برائیڈ بننے کی تیاری کر، جوان لڑکیاں گھر سے وداع ہوں تو ممیاں خوش ہوتی ہیں۔ ممی کی خوشی تو دوہری ہے نا۔

جی ممی۔۔۔ آئی۔

۲۱ جولائی

چلو جی چھٹی ہوئی۔ مومی مسز فاروقی بن گئی۔

ہم نے ولیمہ بھی اُڑا لیا۔ قصہ ختم ہوا۔

پہلے تو میں اسے انکل سمجھتا رہا۔ مجھے کیا پتہ، اس روز سینما ہال میں ہاتھ پکڑے بیٹھے تھے۔ بات سمجھ میں آ گئی۔ میں بھی سوچ رہا تھا کہ مجھے کیوں انوائیٹ کیا جا رہا ہے۔ کبھی فلم پر کبھی انٹر کان، کبھی کہیں، کبھی کہیں۔

مجھے کیا پتہ کہ وہ تو مجھے استعمال میں لا رہی ہے۔ وہ تو جلدی پتہ چل گیا ورنہ اپنا کباڑہ ہو جاتا۔۔۔ خیر اس نے مجھے استعمال کیا ہے تو میں فاروقی کو کروں گا۔ میں کب بخشنے والا

ہوں۔

ویسے آدمی بہت اچھا ہے۔ بڑا افسر ہونے کے باوجود ہے رسن رسٹر۔ یار باش ہے۔ محبت سے ملتا ہے۔ دوج نہیں رکھتا۔ میں نے بھی وہ بے تکلفی چلا رکھی ہے کہ کبھی نکلنے نہ پائے گا۔ جاب دلائے گا۔ اچھا گریڈ، اونچا سا، ریکوئسٹ کرنے کی ضرورت نہیں، دیکھنا آپ ہی آپ کرے گا۔

شادی سے پہلے مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ کیوں ظفر میں شادی کر لوں کیا خیال ہے ادھیڑ سے کروں یا نوجوان سے مومی کیسی رہے گی۔ مان جائے گی کیا۔ تم تو اس کے دوست ہو ذرا اندازہ لگاؤ۔

شادی ہوگئی تو میں نے پوچھا۔ فاروقی کیسی رہی بولا۔ فی الحال تو مزے کی ہے۔

پہلے تو میں مومی کے دوست کی حیثیت سے ملتا تھا۔ اب فاروقی کے دوست کی حیثیت سے مومی کے گھر جاتا ہوں۔

اُوں ہُوں اب مومی وہ مومی نہیں رہی۔ وہ بیگم بن گئی ہے۔ جھلمل ساڑھیاں، ریشمی سوٹ، بُندے، ہار، چوڑیاں یہ ٹو کرا بال۔ نہ وہ جین رہی، نہ لٹکتے بال، نہ تھیلا، نہ ٹپ ٹپ، نہ یہ جاوہ جا، نہ میٹر آف فیکٹ بات، اب تو لبھا لبھا کر بات کرتی ہے۔ آنکھیں مٹکاتی ہے، گھورتی نہیں، مُسکاتی ہے۔

اب اپنے کو کوئی انٹرسٹ نہیں رہا۔ جو افیئر ہی چلانا ہے تو وہ رہی سامنے فرحتو، کب سے ایک بھرپور نگاہ کی منتظر بیٹھی ہے۔ اک نگاہ ڈالوں تو دو دن دھواں دیتی رہے۔

میاں ظفر اب گھر آ جاؤ۔ کوئی سنبل مومی نہیں ملے گی تجھے، کوئی فرحتو ہی آئے گی۔ تیرا گھر آباد کرنے کے لیے۔ باورچن کی باورچن، بیوی کی بیوی، ٹھیک ہے، چلتا ہے، رہا جاب اور گریڈ کا مسئلہ۔ وہ فاروقی جو ہے۔ نو پرابلم مائی ڈیر۔

۶ فروری

میں تو خوامخواہ ڈرتی تھی۔ سوچتی، پتہ نہیں۔ میرڈ لائف کیسی ہوگی۔ خوامخواہ جان ڈولتی رہتی۔ یہ تو کچھ مشکل نہیں نو پرابلم ایٹ آل۔

بس میاں کو تھوڑی سی توجہ دینی پڑتی ہے۔ ایک اِلوژن کھڑی کر دو۔ بہلا دو۔ جیسے بچے کو سویٹ سے بہلا دیا بس پھر سب اچھا۔ اچھا کیا اعلیٰ، پھر پرولیجز ہی پرولیجز، ڈریسز، کمفرٹس، لگژری، سب کچھ، کتنی خوش ہوں میں۔

نوبادر، نوورری، نو پرابلم۔ یوں ہُوں۔ جیسے گلدستہ سجا ہو فلاور پاٹ میں۔۔۔ جب بھی جی چاہے سو جاؤ۔ جب جی چاہے جاگو۔ لیپز آل دی ڈے یا گو اباوٹ، کہیں چلے جاؤ۔ جہاں جی چاہے۔ سوشل وزٹ، کلب، سینما، انٹرکان، ڈرائیو، وانگ چو، نمائش، چاہے اکیلی چاہے فارو کو ساتھ لے جاؤں۔ بس ایک پیار بھری نگاہ ایک بھرپور اٹینشن، امپلسٹ کنسرن، پھر وہ خود بخود پیچھے پیچھے چل پڑتا ہے۔ بڑا انڈر رہے۔ افکشنیٹ لیپ ڈاگ بنالو۔ جب جی چاہے آ۔۔۔ واٹ ہیپی نس۔

کبھی کبھی تو میں اس فلاوران دی واز زندگی سے گھبرا جاتی ہوں۔ جی چاہتا ہے۔ کوئی پرابلم ہو، کوئی مشکل ہو، سٹرگل ہو۔ پھر سے جین چڑھا کر تھیلا لٹکا کر سڑکوں پر ماراماری کرتی پھروں ساتھ کوئی ساتھی ہو۔ لیپ ڈاگ نہیں۔ لیس ڈارلنگ نہیں۔ رف ہو۔ اُجلا نہ ہو۔ جان ہو اُدھ ہو، ڈرائینگ رومی نہیں۔ گرین یوتھ ہو۔ روغنی پُتلا نہ ہو آگے پیچھے پھرنے والا نہیں، پھرانے والا۔

کتنا احمق نکلا وہ ظفر میدان چھوڑ گیا نہیں تو۔۔۔ چلو چھوڑو ہٹاؤ۔

نہیں نہیں میں خوش ہوں۔ بہت خوش، بہت ہی۔

مجھے کیا میسر نہیں، کس چیز کی کمی ہے۔ افلوائینس ہی افلوائینس، آرام، اقتدار، نہیں نہیں میں کیا بے وقوف ہوں کہ کسی کے آگے پیچھے پھرنے کی خواہش کروں۔ جسے خود آگے پیچھے پھرنے والا میسر ہو وہ۔۔۔ وہ کیوں آگے پیچھے پھرنے کی خواہش کرے بھلا۔

اُوں ہُوں۔ کچی یوتھ کو کیا کرنا ہے۔ خوامخواہ خود کو کانٹوں میں گھسینا۔۔۔ کوئی بات ہے بھلا۔ اور پیشن۔۔۔ پیشن تو تیز دھار ہوتی ہے۔۔۔ اللہ بچائے۔

میں تو اتنی خوش ہوں اتنی خوش ہوں، کہ میرا جی چاہتا ہے رو دوں۔

-☆-

اپسرا حویلی

ٹل بجنے پر پریم دیوتا چونکے۔ اس وقت کون ہوسکتا ہے بھلا۔

شش سیوک بولا۔ کوئی فریادی ہوگا مہاراج۔

اس سمے فریادی۔ پریم دیوتا ماتھے پر تیوری چڑھا کر بولے۔

مہاراج۔ شش سیوک نے کہا۔ فریاد کا کوئی سمے نہیں ہوتا۔

اچھا تو فریادی کو حاضر کرو۔ دیوتا خشمگیں لہجے میں بولے۔

نہ مہاراج۔ شش نے سر لٹکا لیا۔ جد ماتھے پر بل ہوں اور من میں کرودھ ہو وہ سمے فریاد سننے کا نہیں ہوتا۔

دیوتا چونکے۔ مسکرا کر بولے تو کون سا سمے ہوتا ہے۔ سیوک شش بولا مہاراج جد من شانت ہو۔ جو کڑوی کسیلی بے سواد نہ کرے۔ جد ردھے کان ہی کان بن جائے۔ جد سننے والا خود فریادی بن جائے۔ دونوں میں دُوج نہ رہے۔ وہ سمے سننے کا ہوتا ہے۔ مہاراج۔

پریم دیوتا نے جواب دینے کے لیے سر اُٹھایا۔ دیکھا کہ سامنے دروازے میں ایک عورت سر جھکائے چھوئی موئی کھڑی ہے۔

تُم کون ہو؟ دیوتا نے پوچھا۔

میں فریادن ہوں مہاراج۔ عورت نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

بول کیا مانگتی ہے فریادن؟

کچھ بھی نہیں مانگتی مہاراج۔

آپ ہی کہتی ہے۔ فریادن ہوں۔

میری فریاد میں مانگ نہیں مہاراج۔

ششش سیوک یہ کیا کہہ رہی ہے۔ دیوتا نے پوچھا۔

مہاراج، ششش نے جواب دیا۔ فریاد میں مانگ ہوتی ہے، پر ضروری نہیں کہ ہو۔

دیوتا نے سر جھکا لیا۔ بولے اچھا تو بول فریادن تو کیا کہنا چاہتی ہے۔

فریادن نے کہا مہاراج میں استری ہوں۔ میں لاج ہوں۔ سیوا ہوں۔ پتی بھگتی ہوں۔ ممتا ہوں۔ آپ نے میرے ہاتھ میں عورت کی بانہہ پکڑائی تھی اور کہا تھا اس کے انگ انگ میں رچی رہنا۔ اس کی ہر سانس میں اپنی مہک گھولنا۔ ہر آن اسے تھامے رکھنا جس طرح گھوڑی کو لگام تھامے ہے۔

ہاں ہاں پھر دیوتا نے پوچھا۔

مہاراج میں نے ویسے ہی کیا جیسے آپ نے کہا تھا۔ پر آج عورت نے مجھے دھتکار دیا ہے۔ کہتی ہے میں نے سارے بندھن توڑ دیئے ہیں۔ میں آزاد ہوگئی ہوں۔ مجھے کوئی سنگ سہارا نہیں چاہیے۔

نہیں نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ دیوتا بولے۔ ہم نے تو استری کے روم روم کے بند بند میں تجھے رچا بسا دیا تھا۔ پھر وہ تجھے کیسے نکال پھینک سکتی ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔

ایسا ہوگیا ہے مہاراج۔ فریادن نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

لیکن پھول سے مہک کیسے الگ ہوسکتی ہے۔

مہاراج پُھول نے مہک کو تیاگ کر رنگ کو اپنا لیا ہے۔ مدھم کو چھوڑ کر بھڑک کو اُٹھا لیا ہے۔

ششش سیوک سُن رہے ہو۔ یہ کیا کہہ رہی ہے۔

سُن رہا ہوں مہاراج۔ ششش بولا۔

جو استری میں لاج، ممتا نہ رہی تو وہ استری کیسے رہے گی۔ استری نہ رہے تو کیا بن پائے گی۔ دیوتا گویا اپنے آپ سے بولے۔

مہاراج فریادن نے کہا۔ مجھے نہیں پتہ کہ وہ کیا بن گئی ہے۔ میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ اس نے مجھے تیاگ کر بن باسی بنا دیا ہے۔ میں دُکھڑا نہیں روتی مہاراج۔ مجھے اس سے لاگ نہیں۔ لگاؤ نہیں، میں تو صرف یہ پوچھنے آئی ہوں کہ اب میرے لیے کیا آ گیا ہے۔

تو نہیں سمجھتی فریادن۔ دیوتا نے کہا۔ اگر استری نے تجھے تیاگ دیا ہے۔ اگر اس میں استری پن نہیں رہا تو سمجھ لو وہ استری نہیں رہی۔ اگر استری، استری نہ رہے گی تو پھر پرش بھی پرش نہیں رہے گا اور پرمیشور نے جو اِستری اور پُرش کے بیچ پریم بندھن کا ناطہ بنا رکھا ہے۔ وہ ٹوٹ جائے گا۔

مہاراج شش بولا۔ پریم بندھن تو پرمیشور کی اک چال ہے۔ اک چلتر ہے۔ جس کے زور پر جیون کی جھجری بھری رہتی ہے۔ موت کی ٹپکن اسے خالی نہیں کر پاتی۔

چال ہی سہی پرنتو۔ دیوتا نے کہا اگر ایسا ہو گیا تو سنسار میں جیون کی ندی سُوکھ جائے گی۔

ایسا ہونے کو ہے مہاراج۔ فریادن چلائی۔

فریادن تُم اب جاؤ، یہاں پاٹ شالا میں رُکی رہو۔ ہم پتہ کرتے ہیں۔ پھر تم سے بات کریں گے۔

فریادن کے جانے کے بعد وہ شش سیوک سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔ شش تُم دھرتی پر اُترو۔ راج نائکہ سے ملو۔ اس سے بھید لو۔ اس کے پاس بھانت بھانت کا پرش آتا ہے اور جو اکچھا وہ لے کر آتا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ گھر گھرستی کس حال میں ہے۔ راج نائکہ مرد اور عورت دونوں کے بھید جانتی ہے۔

جب شش سیوک راج نائکہ سے ملنے اپسرا حویلی میں پہنچا تو ابھی شام نہیں پڑی تھی۔ اُس نے دیکھا کہ بہت سی نوجوان طوائفیں اپنی اپنی چوکی پر بیٹھی ہار سنگھار میں مصروف ہیں۔ ساتھ ساتھ ایک دوسرے سے باتیں کر رہی ہیں۔ چُہلیں کر رہی ہیں۔

اس وقت شش نے ایک بوڑھے رئیس عیاشی کا بھیس بدل رکھا تھا۔

اسے داخل ہوتے دیکھ کر ایک طوائف نے منہ موڑ لیا۔ دوسری نے ناک چڑھائی۔

تیسری کی بھویں سکڑ کر کمان بن گئیں۔ چوتھی منہ پر ہاتھ رکھ کر تحقیر سے ہنس دی۔

یہ دیکھ کر شش کا ماتھا ٹھنکا۔ یہ میں کہاں آ گیا ہوں۔ یہ تو اپسرا حویلی نہیں دِکھتی۔ یہاں تو رنگ ہی کچھ اور ہے۔

رنڈی کا کام تو گاہک کا سواگت کرنا ہوتا ہے۔ پرش کو لبھانا ہوتا ہے۔ اسے مائل کرنا ہوتا ہے۔ اس کے اندر کے بالک کو جگانا ہوتا ہے۔ اسے کھیلنے پر اکسانا ہوتا ہے۔ چاہے وہ جوان ہو یا بوڑھا۔ بوڑھے کو تو بُہتا دھیان دیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ وہ دھن کے زور پر آتا ہے اور بوڑھے میں لبھ زیادہ ہوتا ہے۔ رنڈی کا تو کام ہی یہی ہے کہ منش میں لبھ جگائے اور پھر روپیہ بٹورے۔

ہے بھگوان یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ رنڈی گاہک کو دیکھ کر ناک چڑھا رہی ہے۔ منہ موڑ رہی ہے۔ شش مُڑ کر باہر نکلنے کو ہی تھا کہ ایک کونے سے اُدھیڑ عمر کی نائکہ شرنو اس کے پاس آئی۔ بولی آیئے جناب آیئے تشریف لایئے میں آپ کی کیا سیوا کر سکتی ہوں۔

دیوی یہ اپسرا حویلی ہے کیا شش نے پوچھا۔

شرنو نے نووارد کی بات سنی تو اپنا طرزِ کلام بدل کر بولی۔

ہاں مہاراج پدھاریئے پدھاریئے۔ جی آیاں نوں۔ آؤ مہاراج بیٹھ کے بات کرو۔ کس لیے یہاں آ کر ہماری شوبھا بڑھائی۔ سُر سنگیت کے رسیا ہو تو بتاؤ۔ ناچ نرھت چاہو ہو تو، جوبن کے پُجاری ہو تو، بانکپن کے گاہک ہو تو۔ مہاراج حویلی میں ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر موجود ہے۔ جو چاہو جیسی چاہو بس اک بار حکم دو۔ یہ سن کر شش سیوک بیٹھ گیا۔ شرنو وہ بولا جب میں نے حویلی میں پاؤں دھرا اور میں نے دیکھا کہ ان الھڑ رنڈیوں نے منہ موڑ لیا ہے تو مجھے وسواس ہوا کہ مَیں بھول سے کسی اور جگہ آ گیا ہوں۔

شرنو مسکرا کر بولی۔ مہاراج حویلی کے وہ پرانے طور طریقے بیت گئے۔ اب طوائف وہ طوائف نہیں رہی۔ اس نے کینچلی بدل لی ہے۔ روپ بھگت سچ کہتی تھی کہ جب طوائف میں ''مَیں'' جاگے گی تو سمجھ لینا کہ کلجگ آ گیا۔

رُوپ بھگت کون تھی۔ شش نے پوچھا۔

" . مہاراج، وہ راجہ عندلیب راؤ کی پُتری تھی۔ جب جوان ہوئی تو پتہ نہیں من میں کیا سمایا
کہ راج محل کو چھوڑ کر بھگتی کے لیے چل نکلی۔ سولہ سال بھگتی میں گزارے۔ پھر گرو آتما دیو
کے پاس پہنچی۔ بولی مہاراج سولہ سال کی بھگتی کے بعد مجھے پتہ چلا ہے کہ جب تک مندر پر
"میں" کا کلس چڑھا ہے بھگتی اندھی گلی کی سمان کسی اور نہیں لے جائے گی۔ اب بولو مہاراج
"میں" مارن کے لیے میں کیا کروں۔ کہاں جاؤں۔

گرو دیو بولے۔ روپ تو راجہ کی پُتری ہے۔ محل میں پلی ہے۔ خود کو دوجوں سے اُونچا
سمجھنا تیری ہڈی میں رچا ہے۔ تیری "میں" ایسے کیسے نہیں جائے گی۔ بھگت بولی جو میں راجہ
کی پُتری ہوں تو اس میں میرا کیا دوش ہے۔ گرو دیو جس بات پر میرا بس نہیں وہ میرے
راستے کا پتھر کیوں بنے مہاراج۔

گرو دیو سوچ میں پڑ گئے۔ پھر سر اٹھا کر بولے تیرے لیے دھرتی پر "میں" کو نچوڑ
نکالن کی صرف ایک جگہ ہے۔ وہاں جائے گی کیا۔

روپ بولی جاؤں گی مہاراج چاہے وہ پاتال ہی کیوں نہ ہو۔ گرو مسکائے کہنے لگے۔
وہاں نیچ بن کر رہنا ہوگا۔

رہوں گی مہاراج۔ روپ نے جواب دیا۔

اچھا تو اپسرا حویلی میں چلی جا اور رنڈی بن جا۔

روپ نے گھبرا کر گرو دیو کی طرف دیکھا۔ کیا کہا مہاراج گرو دیو ہنسے۔ گھبرا گئی نا۔ تو
رنڈی کے ظاہر پر نہ جا۔ ظاہر میں وہ نرلج ہے۔ ہوس کی ماری ہوئی دِکھتی ہے۔ پر اس کا ایک
اندر کا رُوپ بھی ہے۔ رنڈی خود کے لیے نہیں دوجوں کے لیے جیتی ہے۔ دوجوں کو خوش کرنا
اس کا دھرم ہے۔ دُوجا چاہے اُجلا ہو یا میلا۔ لڑاکا ہو یا پریمی۔ دھن وان ہو یا اُچکا۔ سڑی ہو
یا ہنسوڑ۔ اس گھاٹ کا متوالا ہو یا اس گھاٹ کا۔ کوئی بھی ہو۔ کیسا ہی ہو وہ اسے خوش کرتی
ہے۔ چاہے اپنا من جل جائے۔ چاہے اپنی پریم جھجری پھوٹ جائے۔ وہ اپنی "میں" کو
تیاگ دیتی ہے۔ بس وہی ایک جگہ ہے جہاں تیری "میں" کا پھوڑا پھوٹ سکتا ہے۔ پرنتو
ایک بات یاد رکھنا۔ اوش۔ اپنے گاہکوں سے جتنا پیسہ بٹور سکے بٹورنا۔ پر اسے اپنے پاس نہ

رکھنا۔ اسے اپنا نہ جاننا۔ اسے ہاتھ نہ لگانا اور جو ہاتھ لگائے تو صرف دو جوں میں بانٹنے کے لیے، وہ تھی روپ بھگت مہاراج۔ شرنو نے کہا۔ وہ یہاں آئی۔ پورا ایک سال یہاں رہی اور جاتے سمے کہنے لگی۔ شرنو۔ اب سمے بدل رہا ہے۔ رنڈی میں ''مَیں'' اُبھر رہی ہے۔ اور تُو جان لے جب رنڈی میں ''میں'' اُبھر آئی۔ جد وہ اپنی مرضی سوچنے لگی تو سمجھ لینا کلجگ آ گیا۔

سچ کہتی تھی۔ روپ بھگت۔ شش نے ہنکارا بھرا۔

مہاراج، شرنو بولی، رنڈی تو پانی سمان ہووے ہے، چاہے اسے پیالے میں ڈال لو چاہے کٹوری میں، ہر روپ میں ہر رنگ میں ڈھل جاتی ہے۔ وہ بن جاتی ہے جو دوجا چاہے ہے۔ دوجا میٹھے کا رسیا ہو تو مٹھاس بن جاتی ہے۔ دوجا سی سی کرنے کا متوالہ ہو تو مرچ بن جاتی ہے۔ اس کا اپنا کوئی سواد نہیں ہوتا مہاراج۔

شرنو اب تو رنڈی کا وہ رنگ نہیں رہا جس کی تو بات کر رہی ہے۔ شش نے نوجوان رنڈیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ پھر وہ اٹھ بیٹھا۔ بولا تیرے پاس سے اٹھ کر جانے کو جی نہیں چاہتا۔ پر مجھے راج نائکہ سے ملنا ہے۔

یہ سن کر شرنو پھر اٹھ بیٹھی۔ پدھاریئے مہاراج کہہ کر وہ راج نائکہ کی طرف چل پڑی۔

راج نائکہ کے منہ پر جُھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ بال کھچڑی ہو رہے تھے۔ پھر بھی وہ ریشمی کپڑے پہنے زیور لگائے بیٹھی اپنے بال سنکھار رہی تھی۔

شش کو آتے دیکھ کر اس نے جلدی جلدی کھلے بالوں کا جوڑا بنایا اور اٹھ کر شش کا سواگت کیا۔ جب شرنو چلی گئی تو شش نے اپنی جیب سے سونے کا کڑا نکالا۔ بولا یہ تمہاری بھینٹ ہے دیوی۔ سونے کو دیکھ کر راج نائکہ کا چہرہ کھِل اُٹھا۔ بولی۔ اس کی کیا ضرورت تھی مہاراج مَیں تو ویسے ہی باندی ہوں۔ حکم کرو کیا چاہتے ہو۔ میں تو آپ کی سیوا کے لیے یہاں بیٹھی ہوں۔ بلکہ آپ نے خود آنے کی تکلیف کیوں کی۔ مجھے بلوا بھیجتے۔ شش کو پتہ چل گیا کہ سونا کام کر گیا۔ بولا۔ دیوی۔ پیاسا ہی کنویں کے پاس آتا ہے۔

راج نائکہ مسکرائی کہنے لگی تو بولو مہاراج کو کیسی پیاس ہے کس کی پیاس ہے۔ کسی پر من

رتجھ گیا ہے یا کسی کو گھر ڈالنے کا دھیان ہے۔

شش نے جواب دیا میری پیاس کچھ اور ہے دیوی۔ میں تو تیرے پاس اس طرح آیا ہوں جیسے بالکا گُرو کے پاس جاتا ہے۔ میں تو تیرے دوار بُدھی کی تلاش میں آیا ہوں۔ سچ کی ڈھونڈ کرنے آیا ہوں۔

راج نائکہ کے ماتھے پر سوچ کی تیوری پڑ گئی۔ دیر تک وہ سر نوائے بیٹھی رہی۔ پھر سر اُٹھا کر بولی۔

مہاراج جو سچ کی ڈھونڈ میں ہو تو کسی رشی منی کے پاس جاؤ۔ نائکہ تو سچ سے منہ موڑ کر بیٹھی ہے۔ جو بُدھی کی تلاش ہے تو کسی ودھوان کے پاس جاؤ کسی عالم کو ڈھونڈو۔ شش بولا۔ نہ دیوی مجھے پڑھی پڑھائی، سُنی سنائی بُدھی نہیں چاہیے۔ اس لیے میں تیرے پاس آیا ہوں۔ تیرے پاس بیتی بُدھی ہے۔ تُو نے جیون کو بیت کر دیکھا ہے۔

مہاراج کئی قسم کی دانائی ہوتی ہے۔ آپ کو کون سی دانائی کی تلاش ہے۔ نائکہ نے پوچھا۔

مجھے مرد اور عورت کے آپس کے ناطے کا بھید جاننا ہے۔ شش نے جواب دیا۔

راج نائکہ پھر سوچ میں پڑ گئی۔ وہ حیران تھی کہ یہ کیسا مرد ہے جو پھُول کی خوشبو سے محفوظ ہونے کی نہیں سوچ رہا۔ اس کا بھید پانے کی خواہش لیے بیٹھا ہے۔ مرد کا کام تو عورت سے خوشی حاصل کرنا ہے۔ اس کا بھید پانا نہیں۔ پھر اس نے خود کو سنبھالا اور کہنے لگی۔ نائکہ بھلا عورت کا بھید کیسے پا سکتی ہے مہاراج۔

نائکہ بھی تو عورت ہی ہوتی ہے۔ شش نے کہا۔

بڑا فرق ہوتا ہے مہاراج۔

وہ کیسے۔ شش نے پوچھا۔

ذرا سوچو مہاراج مرد گھر کی استری کو چھوڑ کر طوائف کے پاس کیوں آتا ہے۔ نائکہ نے کہا۔ اگر عورت اور طوائف میں فرق نہ ہو تو کیوں آئے سچ کہتی ہو۔ شش نے سر ہلا دیا۔ شش کا مقصد تو یہی تھا کہ راج نائکہ باتیں کیے جائے، کیے جائے اور پھر ان میں سے وہ

اپنے مطلب کی باتیں چُن لے بڑا فرق ہے مہاراج۔ راج نائکہ نے کہا۔ گھر کی عورت سہتی زیادہ ہے کہتی کم کم ہے۔ پریم لگن بیتے زیادہ ہے جتاوے کم کم ہے۔ جلے تو ہے پر بھڑک کر نہیں جلے ہے۔ مدھم مدھم۔ اندر اندر بھیٹر لگی ہووے ہے اوپر شانت دِکھے ہے۔ اپنی خواہشوں کو لاج کی اوڑھنی تلے چھپائے رکھے ہے۔

اور رنڈی شش نے پوچھا۔

رنڈی میں لاج نہیں ہوتی۔ وہ سہتی نہیں صرف کہتی ہی کہتی ہے۔ پریم لگن بیتے نہیں ہے صرف جتاوے ہی جتاوے ہے۔ جلے نہیں پر یُوں نظر آوے ہے جیسے بھڑک کر جل رہی ہو۔ اندر سے خالی ہووے ہے۔ پر باہر بھیٹر لگاوے ہے۔ لگائے رکھے ہے۔

سچ کہتی ہو شش نے ہنکارا بھرا۔

جب مرد گھر والی کی ایک رنگی سے اُکتا جاتا ہے تو وہ حویلی کا رُخ کرتا ہے۔ نائکہ نے بات جاری کی۔ اسے گھر والی کی کٹوری اوندھی نظر آتی ہے۔ اس لیے وہ بھری ہوئی اُچھلتی ہوئی بلوری پیالی کی طرف آتا ہے۔ مہاراج میں تو صرف اُچھلتی پیالیوں کو جانتی ہوں۔ میں گھر کی عورت کو کیا جانوں۔ نائکہ خاموش ہوگئی۔

شش سوچ میں پڑ گیا۔ کون سی چال چلوں کہ راج نائکہ بولنے پر مائل ہو۔

اُدھر راج نائکہ سوچ میں پڑی تھی کہ یہ شخص کون ہے۔ کیوں بھید لے رہا ہے۔ کس کے لیے بھید لے رہا ہے۔ وہ اور بھی محتاط ہوئی جا رہی تھی۔

دیکھ دیوی۔ شش بولا۔ اندر سے تو استری ہی ہے نا۔ نائکہ تو ایک بہروپ ہے جو تُو نے دھار رکھا ہے تا کہ کاروبار چلتا رہے۔

یہ سچ ہے مہاراج کہ نائکہ میں بھی عورت ہوتی ہے جسے وہ اپنی من کے پلّو میں یوں باندھے رکھتی ہے جیسے گاؤں والی اپنی چُنّی کی کنی میں پیسے باندھ رکھتی ہے۔ لیکن مہاراج یہ بات تو گھر والی پر بھی ایسے ہی بیٹھتی ہے جیسے نائکہ پر۔

میں سمجھا نہیں دیوی، شش نے کہا۔

مہاراج نائکہ بولی۔ جس طرح طوائف کے من میں عورت کی پوٹلی بندھی ہوتی ہے

اسی طرح عورت کے دل میں طوائف کی پوٹلی بندھی رہتی ہے۔

وہ کیسے دیوی شش نے پوچھا۔

نائکہ نے کہا مہاراج سیدھی بات ہے۔ انسان اس کی قدر نہیں کرتا جو اسے حاصل ہو۔ جو نہ حاصل ہو اس کے سپنے دیکھتا ہے نائکہ کو گھر گھرستنی حاصل نہیں اس لیے وہ گھر کے سپنے دیکھتی ہے۔ گھر گھرستنی کو طوائف کی کشش حاصل نہیں اس لیے وہ طوائف کے سپنے دیکھتی ہے۔

دیوی۔ شش نے کہا۔ تیری حویلی میں رنگ رنگ کے پرش آتے ہیں تو ان کو دیکھتی ہے۔ ان کی اکشاؤں کو جانتی ہے وہ گھر میں پوری نہیں ہو پاتیں جنہیں پورا کرنے کے لیے وہ یہاں آتے ہیں اور یوں تجھے پتہ چل جاتا ہے کہ گھر گھرستنی میں کیا ہے، کیا نہیں۔ تُو آنے والوں کے روپ سے گھر کی عورت کے رنگ ڈھنگ کو خوب جانتی ہے۔

راج نائکہ یہ سن کر گہری سوچ میں پڑ گئی۔ اور دیر تک سر جھکائے بیٹھی رہی۔ پھر اس نے سر اُٹھایا۔ بولی مہاراج ایک بات پوچھوں۔

ہاں ہاں پوچھو۔ ایک کیا دس پوچھو۔ شش مسکرایا۔

یہ بتاؤ مہاراج کہ آپ یہاں خود آئے ہیں کیا؟

میں نہیں سمجھا۔ شش نے سوچنے کے لیے وقت حاصل کرنے کے لیے کہا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنا بھید رکھے رہے یا کھول دے۔

نائکہ مسکرائی۔ بولی مہاراج جو یہاں خود آتا ہے وہ ایسی باتیں نہیں پوچھتا جیسی آپ پوچھ رہے ہیں۔

اب بات چھپانا تو بے کار تھا اس لیے شش نے فیصلہ کر لیا کہ وہ نائکہ سے ساری بات کہہ دے گا۔

تُو نے میرا بھید کیسے جان لیا دیوی، شش ہنس کر بولا۔

نائکہ کہنے لگی مہاراج اپسرا حویلی تو بھید حویلی ہوتی ہے۔ یہاں ہر کوئی اپنا بھید رکھنے کے لیے پورا زور لگاتا ہے۔ نائکہ اپنا بھید چھپاتی ہے۔ گاہک اپنا بھید چھپاتا ہے اور بھید کی یہ

عادت ہے مہاراج کہ جتنا چھپاؤ اتنا کھل کھل جاتا ہے۔ پھوٹ نکلتا ہے تو مہاراج اس حویلی میں سارے ہی پردوں سے ڈھکے ہوتے ہیں۔ پرنتو سارے ہی ننگے ہوتے ہیں۔

کتنی سیانی ہے تو دیوی، شش نے کہا۔

وہ تو مہاراج میں پہلے ہی جان گئی تھی کہ آپ یہاں خود نہیں آئے۔ پر بھیجنے والے کا پتہ ابھی تک نہیں چلا۔ چلیے تو معلوم ہو کہ کس خیال سے بھیجا ہے۔ صرف جاننے کے لیے کہ جان کر جانی بات کو برتنے کے لیے۔

یہ سن کر شش نے نائکہ کو ساری بات کہہ سنائی۔ جسے سن کر نائکہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ بولی مہاراج پہلے ہی بتا دیتے تو میں بات ٹالن میں نہ لگی رہتی۔

شش ہنسنے لگا۔

نائکہ بولی۔ مہاراج فریادن سچی ہے۔ عورت نے نسائیت کو تیاگ دیا ہے۔

تمہیں کیسے پتہ ہے جو اتنے بھروسے سے کہہ رہی ہے۔ شش نے پوچھا۔

مہاراج مجھے پتہ ہے۔ یہ سُنی سنائی نہیں بیتی کہہ رہی ہوں۔

وہ کیسے؟ شش نے پوچھا۔

نائکہ نے جواب دیا مہاراج حویلی ویران ہوتی جارہی ہے۔ حویلی میں اب وہ بھیڑ نہیں رہی۔ بہت کم لوگ آتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ کچھ جس کے لیے وہ یہاں آتے تھے۔ اب انہیں گھروں میں مل جاتا ہے۔

کیا عورت میں رنڈی کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ شش نے پوچھا۔

مہاراج۔ نائکہ نے جواب دیا۔ گھر گھرستنی نے لاج کی اوڑھنی کو سر سے اُتار دیا ہے۔ اس نے نسائیت کی خشبو کو تیاگ کر رنگ اپنا لیا ہے۔ بھڑکیلا رنگ۔ پہلے وہ مرد کے ہاتھ کا کھلونا بننے میں خوشی محسوس کرتی تھی۔ اب اس نے مرد کو اپنے ہاتھ کا کھلونا بنانے کا فن جان لیا ہے۔ ہاں مہاراج۔ عورت میں طوائف کا رنگ اُبھرتا آرہا ہے۔ اسی وجہ سے حویلی ویران ہوتی جارہی ہے۔

اچھا تو اب ہو گا کیا۔ شش گویا خود سے بڑے فکر مندانہ انداز میں بولا۔

اگر استری نہ رہی تو مرد، مرد نہ رہے گا۔

ہاں مہاراج۔ مرد، مرد نہیں رہا۔ نائکہ نے جواب دیا۔ دونوں کے لباس ایک جیسے ہو گئے ہیں۔ چال ڈھال ایک جیسی ہو گئی ہے۔ رنگ روپ ایک جیسا۔ کوئی فرق نہیں رہا مہاراج۔

کیا انہیں الگ الگ ہونا چاہیے اس بارے میں تُو کیا کہتی ہے؟ شش نے پوچھا۔

ضرور الگ ہونا چاہیے مہاراج۔ ایک سی چیزیں ایک دوجے کو لبھاتی نہیں۔ اِک دوجے کو چھیڑتی نہیں۔ کھینچتی نہیں۔ جو مرد عورت میں چھیڑ نہ رہے لبھاوٹ نہ رہے تو پھر رہا کیا۔ مہاراج اگر عورت اک دوجے کے اُلٹ ہوں تو ایک دوجے کو کھینچیں گے۔ جو ٹھنڈی اور گرم تاریں ملیں تو شعلہ نکلتا ہے۔ ایک سی تاریں ہوں تو کچھ بھی نہ ہو۔

شش گھبرا گیا اور اضطراب میں بولا تو پھر ہو گا کیا۔

کچھ نہیں ہو گا مہاراج۔

یہ تم کیا کہہ رہی ہو دیوی، شش بولا۔

سچ کہہ رہی ہوں مہاراج۔

جو استری بدل گئی تو۔

نہیں بدلے گی۔ نائکہ مسکرائی۔

تُو خود ہی تو کہہ رہی ہے دیوی کہ وہ بدل رہی ہے۔

مہاراج جب وہ نمک کھا کھا کر اکتا جاتی ہے تو پھر میٹھا کھانے لگتی ہے صرف منہ کا سواد بدلنے کے لیے چار دن میٹھا کھا کر منہ پھر جائے اور وہ پھر سے لون کو اپنا لے گی۔

کیا یہ سچ ہے؟ شش نے چونک کر پوچھا۔

راج نائکہ مسکرائی۔ بولی مہاراج بیتے سمے میں کئی بار عورت اپنی ڈگر سے ہٹ کے چلی تھی۔ پرنتو صرف اس لیے کہ پھر سے اپنی ڈگر کو اپنا لے۔ وہ اپنا آپ صرف اس لیے کھو دیتی ہے کہ اسے پھر سے پا لے۔ پھر سے خود کو جانے۔

تو پھر میں جا کر دیوتا مہاراج سے کیا کہوں۔

انہیں داسی کا پرنام دینا مہاراج۔ ان سے کہنا چنتا نہ کریں۔ جو آج عورت میں اُبال آیا ہے اس کی چنتا نہ کریں۔ اُبال کا کام آنا اور آ کر چلے جانا ہوتا ہے۔ جھگڑا کا کام چلتے رہنا نہیں بلکہ چل کر تھم جانا ہوتا ہے۔ وہ اس لیے آتا ہے کہ لوگ خاموشی اور سکون کی قدر جانیں۔

لیکن دیوی یہ جھگڑا تو پتہ نہیں کب تک چلے۔

نائکہ بولی۔ دھیرج دھرو مہاراج اسے چلنے دو۔ روکو نہیں۔ جو روکو گے تو دب جائے گا۔ دلوں میں بیٹھ جائے گا۔ پھر اسے نکالنا مشکل ہو جائے گا۔

لیکن دیوی ہم فریادن کو کیا جواب دیں۔ ششی نے پوچھا۔

مہاراج فریادن کو ہماری حویلی میں بھیج دو۔

ششی گھبرا گیا۔ بولا دیوی کیا لاج اور ممتا کو یہاں بھیج دیں۔ لاج ممتا کا حویلی سے کیا ناطہ۔ کیا رنڈی لاج کو اپنا لے گی۔

مہاراج نائکہ مسکرائی۔ بولی بے شک لاج میں بڑی پوِترتا ہے۔ پر یہ نہ بھولو مہاراج کہ اصل میں لاج بھی اِک سنگار ہے۔ گالوں پر لالی چاہے ڈبیہ سے نکال کر لگا لو چاہے شرما کر لگا لو۔

شرما کر لالی کیسے لگاؤ گی دیوی۔ ششی نے ٹوکا۔

مہاراج شرمانے کی لالی خون سے سُرخی ہے۔ لاج خون کو رگوں میں دوڑا کر گالوں میں لے جاتی ہے۔ چاہے کیسے بھی لے جاتی ہے مہاراج پر یہ سچ ہے کہ لاج اِک سنگار ہے۔ مطلب ہے دوجے کے دھیان کو اپنی طرف کرنا دوجے کو لبھانا۔ مائل کرنا۔

ہُوں۔ ششی مسکرایا۔

مہاراج مرد نرلج پنے سے جلد اکتا جائے گا۔ پھر وہ طوائف کی طرف آئے گا۔ طوائف کی لاج اسے بھرما لے گی۔ پھر گھر گھرستن دیکھے گی کہ گھر والا لاج کے لئے حویلی میں جاتا ہے تو وہ اسے گھر رکھنے کے لیے پھر سے لاج کو اپنا لے گی اور رنڈی پھر سے نرلج ہو جائے گی۔ یوں چکر پورا ہو جائے گا۔ اس لیے مہاراج۔ فریادن کو حویلی میں بھیج دو۔

-☆-

آغا اور اسمارائیں

اگر آپ سیاحت سے دلچسپی رکھتے ہیں تو آپ سفید آباد ضرور گئے ہوں گے۔ چک نارو سے جو برانچ لائن شمبھیر کو جاتی ہے سفید آباد اسی لائن پر واقع ہے پہلے سفید آباد کو چٹی ڈھیری کہا کرتے تھے۔ مدفون شہروں کو ہمارے ہاں ڈھیری ہی کہتے ہیں۔ اب کھدائی کے بعد پتہ چلا ہے کہ تقریباً ایک ہزار سال پہلے وہاں رانگاہ قوم آباد تھی ان دنوں سفید آباد کا نام امرت پورن تھا۔

سفید آباد کی اہمیت صرف آثارِ قدیمہ کی وجہ سے ہی نہیں ویسے بھی یہ علاقہ بے حد انوکھا اور خوبصورت ہے سفید آباد سے بیس میل دُور چٹا پہاڑ شروع ہو جاتا ہے۔ ایک دم دودھ سی چٹی سفید زمین اُبھر آتی ہے ایسے محسوس ہونے لگتا ہے جیسے آپ کثیف زمین کو چھوڑ کر کسی منور سیارے پر آپہنچے ہوں۔

اگر آپ کبھی سفید آباد گئے ہیں تو یقیناً آپ نے آغا کو دیکھا ہوگا۔ جب گاڑی سٹیشن میں داخل ہوتی ہے تو وہ پلیٹ فارم پر لالٹین کے نیچے پتھر کے بنچ پر بیٹھا ہوا نظر آتا ہے۔ جب گاڑی رُک جاتی ہے تو وہ اُٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے بڑے وقار سے آنے والے ٹورسٹوں کا جائزہ لیتا ہے۔

وہ ایک درمیانے قد کا پُروقار بوڑھا ہے اس کی عمر ۶۵ سال سے کچھ زیادہ ہوگی۔ بڑا ول ڈریسڈ آدمی ہے اگرچہ اس کا سوٹ پرانے فیشن کا ہوتا ہے لیکن ایسے لگتا ہے جیسے ابھی ابھی ڈرائی کلینرز سے آیا ہو۔ اس کا کالر سفید اور سٹف ہوتا ہے۔ نکٹائی کی جگہ ایک صاف ستھری بو لگی ہوتی ہے اور ہاتھ میں چھڑی ہوتی ہے۔

اس کے چہرے پر سنجیدگی، امید اور بشاشت نمایاں ہوتے ہیں بشرطیکہ آپ اس سے مخاطب ہوں اگر وہ اکیلا بیٹھا ہو تو چہرے پر چھوٹی چھوٹی جھریاں یوں رینگتی ہیں جیسے دکھ کے اتھاہ سمندر میں تنکے جھول رہے ہوں یا ریت کے گھروندے میں چیونٹیاں رینگ رہی ہوں۔

آنے والے سیاحوں کا جائزہ لے کر وہ نوجوان نووارد کی طرف بڑھتا ہے گڈ مارننگ سر کتنا اچھا دن ہے آج آپ امرت پورن دیکھنے آئے ہیں نا۔ آیئے آیئے میں آپ کو لے چلتا ہوں، میں امرت پورن کی اینٹ اینٹ سے واقف ہوں۔ بگی مندر۔ پارا کھوہ۔ رانگا نا مانگ سب جگہوں سے واقف ہوں۔ آیئے آیئے میں آپ کو سب دکھاؤں گا۔ یس یس آئی ایم گائیڈ بٹ نو نو نو بخشیش۔ تھنگ۔

۱۹۷۳ء میں جب میں پہلی مرتبہ سفید آباد گیا تھا تو اسے مل کر حیران ہوا تھا خصوصاً جب اس نے کہا یس یس آئی ایم گائیڈ بٹ نو نو نو فی نو بخشیش تھنگ۔ اس کی اس بات نے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا۔ آپ سے کیا پردہ میں اس پر شک کرنے لگا تھا۔ دور حاضرہ میں ہمیں عادت پڑ گئی ہے کہ ہر بات میں مقصد اور مفاد تلاش کریں اور مقصد اور مفاد دکھائی نہ دے تو بے نام شکوک پیدا ہونے لگتے ہیں۔ یہ کیسا گائیڈ ہے میں نے سوچا جو نہ تو فیس لیتا ہے اور نہ بخشیش۔

امرت پورن سفید آباد سے دو میل کے فاصلے پر ہے ہم دونوں تانگے پر سوار ہو گئے۔

میرے لیے یہ ایک عجیب و غریب سفر تھا۔ چاروں طرف دودھیا پہاڑ پھیلا ہوا تھا چٹا سفید براق سا پہاڑ۔ اگرچہ سفید پہاڑ چاک کا پہاڑ نہیں پتھر کا ہے لیکن یہ پتھر سخت نہیں بلکہ ملائم ہے۔ دیکھنے میں پتھر لگتا ہی نہیں۔ نہ تو اس میں تہیں ہیں نہ ریشے۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ یہ سفید پتھر سورج کی شعاعوں کو ری فلیکٹ نہیں کرتا بلکہ انہیں جذب کر لیتا ہے اور جذب کرنے کے باوجود گرم نہیں ہوتا۔ میں ان خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ آغا بولا۔ اس سفید پتھر کی نوعیت کے متعلق میری معلومات مکمل نہیں ہاں اسماء جانتی ہے اسماء نے پوری تحقیق کی ہے جب ہم سفید آباد آ کر آباد ہوئے تھے تو سب سے پہلے اسماء نے اس سفید پتھر پر تحقیق

کی تھی کہ یہ دھوپ میں تپتا کیوں نہیں۔ اتنا ملائم کیوں ہے اس میں لیئرز کیوں نہیں ہیں اور پھر یہاں کاشت کیوں نہیں ہوسکتی۔ اسماء نے ان سب باتوں پر تحقیق کی تھی وہ آپ کو یہ سب باتیں بتاسکتی ہے۔

پھر دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ میں اسماء سے متعارف نہیں ہوں وہ ہنس پڑا۔ بولا اسماء میری بیٹی ہے وہ ایم ایس سی ہے۔ میں اور اسماء اکٹھے رہتے ہیں اس کی والدہ فوت ہوچکی ہے نا۔ اس لیے میں نے دوسری شادی نہیں کی۔ کیسے کرتا؟ کر لیتا تو اسماء کی تربیت کون کرتا؟ وہ بڑی پیاری بچی ہے۔ آپ اسے مل کر بے حد خوش ہوں گے آغا نے میری طرف ملتجی نظروں سے دیکھا۔

اس وقت ہم موڑ پر پہنچ چکے تھے۔ موڑ مڑتے ہی میری توجہ امرت پورن کی طرف منعطف ہوگئی۔ ہمارے سامنے پہاڑ کی ایک چوٹی پر سفید پتھر کے گھروندے سے بنے ہوئے نظر آرہے تھے جن میں کالی دھاریوں کے بارڈر دوڑ رہے تھے۔

ارے! میں نے پوچھا یہی امرت پورن ہے کیا؟

آغا نے چھڑی اٹھائی اور اشارہ کرتے ہوئے بولا یہ چوٹی کے اوپر جو عمارتیں نظر آ رہی ہیں یہ امرت پورن کے محلات ہیں اس سے پرے نچان میں امرت پورن کا شہر ہے۔ شہر تو سب ٹوٹ پھوٹ چکا ہے لیکن محلات ابھی تک اچھی حالت میں ہیں۔ شہر کے پاس پاراکھوہ ہے یہ غاروں کا ایک سلسلہ ہے۔

سب سے بڑا غار رانگا نامانگ ہے جس میں رانگاہ قوم کا اکٹھ ہوا کرتا تھا اس کے ایک کونے میں بلّی مندر ہے۔ بلّی مندر دراصل ایک قربان گاہ ہے جہاں دیوتاؤں کے حضور قربانی پیش کی جاتی تھی لیکن میں ساری تفصیلات سے واقف نہیں ہوں۔ ہاں اسماء نے تحقیق کرکے امرت پورن پر ایک کتاب لکھی ہے لیکن اسماء ابھی اسے چھپوانے کے لیے تیار نہیں۔ وہ ہنسنے لگا کہتی ہے یہ تحقیق ابھی خام ہے جب تک امرت رس کا کھوج نہ لگے کتاب مکمل نہیں ہوسکتی۔ پھر وہ ہنسنے لگا۔ اسماء میں تکمیل کا جذبہ بہت شدید ہے وہ پرفیکشن کی دیوانی ہے۔ امرت رس ایک چشمہ تھا جو بُوند بُوند گرتا تھا۔ جسے رانگاہ فرٹیلیٹی کا چشمہ سمجھتے تھے۔ آج کل

اسماء امرت رس کی کھوج لگا رہی ہے۔ اُدھورے کام سے اسے قطعی دلچسپی نہیں لیکن جب آپ اسماء کو دیکھیں گے تو آپ حیران رہ جائیں گے اس کے چہرے سے پتہ نہیں چلتا کہ وہ اس قدر عالمانہ خیالات کی مالک ہے۔

آپ جانتے ہیں علم کا خبط عورت کے چہرے پر ایک عجیب سی کرختگی پیدا کر دیتا ہے جیسے ہارڈ بوئیلڈ ایگ ہو لیکن نہیں اسماء کے چہرے پر بڑی معصومیت ہے۔ معصومیت اور شگفتگی دیکھیں تو ایسے لگتا ہے جیسے وہ مشکل سے دس جماعتیں پاس ہو۔ کتنی حیران کن بات ہے لیکن ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ آپ خود ہی دیکھ لیں گے آج ہی۔

عین اس وقت تانگے والے نے پوچھا۔ آپ پہلے کھوہ کی طرف جائیں گے یا محل دیکھیں گے پیشتر اس کے کہ میں جواب دیتا آغا بولا پہلے کھوہ کی طرف چلو۔ تانگہ بان نے دائیں طرف تانگہ موڑ دیا۔

آپ ہمیشہ سے یہیں مقیم ہیں کیا۔ میں نے آغا سے پوچھا۔

نہیں نہیں وہ بولا۔ میرا نام آغا ثناء اللہ ہے میں نے ساری زندگی گورنمنٹ سروس میں گزاری ہے پھر ریٹائرمنٹ کے دو سال بعد اتفاق سے اسماء اور میں سفید پور آئے اسماء کو یہ جگہ اتنی پسند آئی کہ میں نے یہاں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک چھوٹا سا مکان بنوا لیا ہے بڑا مکان بنوانے کی کیا ضرورت تھی۔ بیٹیاں تو پرایا دھن ہوتی ہیں۔ اسماء کی شادی ہو جائے گی تو میں اکیلا رہ جاؤں گا۔ بڑا مکان کیا کرنا ہے۔

آپ نے اتنا پڑھا لکھا کر اپنی بیٹی کو گھر بٹھا رکھا ہے آغا صاحب۔ میں نے ویسے ہی کچھ کہنے کے خیال سے کہا۔

نہیں نہیں وہ بولا بیٹی سے ملازمت کرانے کا مجھے کوئی حق نہیں اور پھر شاید اس کا ہونے والا خاوند اسے پسند نہ کرے۔ ہاں اگر شادی کے بعد اس کا ہونے والا خاوند چاہے تو بیشک نوکری کرے۔ آپ کسی بیٹی کے باپ نہیں ہیں نا؟ وہ ہنسنے لگا۔

ابھی تو نہیں میں نے جواب دیا۔

آپ باپ کی ذمہ داری کو نہیں جانتے صاحب! میں نے اپنی بیٹی کو آئیڈیل بیوی

بنانے کی کوشش کی ہے اس کا ذہن مغربی ہے اور روح مشرقی۔ سینا پرونا سلائی کڑھائی اور خانہ داری میں اسماء کو بڑی دسترس حاصل ہے صرف پاکستانی ہی نہیں اسے کانٹینٹل کھانے پکانے بھی آتے ہیں اور یہ سب ٹریننگ میں نے اسے بڑی کاوش سے دی ہے۔ اس کا ہونے والا خاوند سکھ بھری زندگی بسر کرے گا۔

کیا آج کا خاوند سکھ بھری زندگی چاہتا ہے۔ میرے جی میں آیا کہ آغا سے پوچھوں لیکن اس وقت آغا اسماء کے دھیان میں کھویا ہوا تھا۔ اس کے چہرے کے ویرانے میں فکر بھری جھریاں یوں سمٹ کر پھیل رہی تھیں جیسے ریت کے گھروندے پر چیونٹے حرکت میں ہوں اس کے چہرے کو دیکھنے کے بعد مجھے پوچھنے کی ہمت نہ پڑی۔

کھوہ کو دیکھنے میں ہمیں پورے دو گھنٹے لگ گئے اس دوران وہ مجھ سے امرت پورن کی باتیں کرتا رہا لیکن ہر چیز کی تفصیل سمجھاتے ہوئے بات اسماء کی طرف مڑ جاتی اور وہ اسماء کے کوائف بیان کرنے لگتا۔

ان دو گھنٹوں میں مجھے امرت پورن کی بجائے اسماء کے کوائف سے زیادہ واقفیت ہو چکی تھی مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ امرت پورن کا نہیں اسماء کا گائیڈ ہو۔

اس کی باتیں سُن سُن کر میرے دل میں اسماء کے لیے عجیب سی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ کیسے نہ ہوتی آغا نے اسماء کے متعلق تفصیلات بیان کر کے میری آنکھوں کے سامنے اسماء کی تصویر کھڑی کر دی تھی۔ وہ کیسے اٹھتی ہے کیسے بیٹھتی ہے کیسے مسکراتی ہے کیسے سوچتی ہے کیسے گفتگو کرتی ہے اس کی آنکھوں میں کتنی شرم وحیا ہے۔ پلکوں میں کتنی معصومیت ہے ٹھوڑی کتنی کتابی ہے۔

پھر جب ہم کھوہ سے واپس آئے اور ہمارا تانگہ محل کی طرف مڑنے لگا تو میں نے تانگے والے کو منع کر دیا کہ محل کی طرف نہ مڑے محل پھر سہی تو آغا کی آنکھوں میں ایک چمک لہرائی بالکل ٹھیک وہ بولا۔ آپ ہوٹل میں نہ ٹھہریں یہاں صرف ایک ہوٹل ہے امرت پورن ہوٹل لیکن وہاں نہ امرت ہے نہ پورن ہے وہ تو سیاحوں کی کھال تک اتار لیتے ہیں۔ مہنگ فروشی کی انتہا ہے۔ چائے کا پیالہ ایک روپے میں۔ ذرا اندازہ لگایئے۔ آپ ہمارے ہاں

ٹھہریئے ہم نے گھر کا ایک کمرہ مہمان کے لیے وقف کر رکھا ہے چھوٹا سہی مگر آرام دہ ہے اور پھر اسماء خود سروس کرے گی۔ اس نے مہمان نوازی کی خصوصی تربیت حاصل کر رکھی ہے۔ دفعتاً وہ رُکا۔ اس نے میرے چہرے کی طرف دیکھا اور گھبرا کر بولا نو نو نو ہم پیئنگ گیسٹ نہیں رکھتے، نو چارج، نو پے منٹ، تھنگ پلیز۔

آغا کے چہرے پر بے بسی، لجاجت اور فکر مندی دیکھ کر میرا دل ڈوب گیا۔ اس وقت مجھے یہ کہنے کی ہمت نہ پڑی کہ مجھے آج ہی واپس جانا ہے۔

جب ہم سٹیشن کے قریب پہنچے تو میں نے ہمت کر کے کہہ دیا کہ مجھے آج ہی واپس جانا ہے۔ اس پر آغا کے چہرے کی ساری جھریاں اس کی آنکھوں اور ہونٹوں کے کونوں پر اکٹھی ہو گئیں اور اس کا چہرہ یوں نظر آنے لگا جیسے دُکھ کا اتھاہ سمندر موجیں مار رہا ہو۔

یہ دیکھ کر میں نے اسے تسلی دی۔ میں نے کہا میں جلدی واپس آؤں گا بہت جلد واپس آؤں گا۔ بہت جلد اس پر اس کے چہرے پر پھر امید کی کرن طلوع ہو گئی۔

جب میں گاڑی میں سوار ہو رہا تھا تو آغا مجھ سے گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ جلد آیئے گا۔ اسماء اور میں آپ کا انتظار کریں گے۔

جب گاڑی چلنے لگی تو پتہ نہیں کیوں میرے منہ سے نکلا آغا صاحب اسماء کو گائیڈ بنا کر اپنے ساتھ کیوں نہیں رکھتے۔

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر اس کی گردن لٹک گئی غالباً وہ سوچ میں پڑ گیا تھا۔

دور تک گاڑی کے دروازے میں کھڑا میں اسے دیکھتا رہا وہ واپس جا رہا تھا گردن یوں لٹکی ہوئی تھی جیسے ٹوٹ گئی ہو واپس جاتے ہوئے اس کی چال میں وقار نہیں تھا۔ کمر جھکی ہوئی تھی۔ ٹانگیں جیسے گھسٹتی جا رہی ہوں اور چھڑی جیسے گر جانے سے بچنے کا واحد سہارا ہو۔

شہر واپس آ کر میں اپنے کام میں مصروف ہو گیا اور امرت پورن کے اس بوڑھے پنشنر کو بالکل بھول گیا پھر ایک دن جمیل نے بات چھیڑی تو چٹا پہاڑ میرے سامنے آ کھڑا ہوا اور پہاڑ کے سامنے آغا یوں کھڑا ہو گیا جیسے سینما کے پوسٹروں پر ہیرو ایستادہ ہوتے ہیں اس

کے شانے کے پیچھے سے اسماء جھانک رہی تھی۔

تمہارا امرت پورن کا ٹرپ کیسا رہا۔ جمیل نے پوچھا۔

میں نے کہا امرت پورن تو میں نے غور سے دیکھا ہی نہیں۔

کیوں جمیل نے پوچھا۔

وہاں ایک بوڑھا پنشنر آغا مل گیا تھا وہ اتنا عظیم کردار تھا کہ اس نے امرت پورن کو ڈھانپ لیا۔

اچھا جمیل ہنسا۔

ہاں! میں نے جواب دیا وہ بڈھا آغا اور اس کی بیٹی اسماء دونوں ہی۔

اسماء جمیل نے دہرایا۔ کہیں وہ آغا ثناء اللہ تو نہیں۔

کچھ ایسا ہی نام بتایا تھا اس نے۔ میں نے جواب دیا۔

جمیل بولا میں اسے جانتا ہوں وہ ابا جان کا کولیگ تھا۔ ہمارے گھر کے ساتھ ہی رہتا تھا۔

اچھا تو اسماء کو بھی جانتے ہو۔

اسماء سے تو میری شادی ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔ جمیل نے کہا۔

ارے میں چلایا مجھے پوری بات بتاؤ یار۔

اس پر جمیل نے سگریٹ سلگایا کرسی پر ٹیک لگائی۔ دو ایک کش لیے اور کہنے لگا۔

آغا کی کہانی بڑی مختصر ہے۔ یہ ایک المیہ ہے ان لوگوں کا المیہ جو اپنی بیٹیوں کی تربیت قدروں کے مطابق کرتے ہیں اپنے نقطۂ نظر سے انہیں مثالی بیویاں بنانے کی کوشش کرتے ہیں وہ یہ نہیں جانتے کہ ہونے والے خاوند کیا چاہتے ہیں اور۔۔۔

فلسفہ نہ بگھارو میں نے اس کی بات کاٹی۔

وہ ہنس پڑا کہنے لگا آغا ایک بلند کردار آدمی تھا اسے اپنی بیوی سے محبت تھی لیکن وہ ایک حادثے میں فوت ہو گئی اس کی صرف ایک ہی بیٹی ہے اسماء۔ آغا نے اپنی تمام تر محبت اسماء پر مرکوز کر دی لوگوں نے بہت سمجھایا کہ دوسری شادی کر لو۔ لیکن آغا نہ مانا اس نے اپنی

تمام تر توجہ اس بات پر لگادی کہ اسماء کو ایک آئیڈیل بیوی بنائے۔

اور وہ کامیاب ہوگیا کیا؟ میں نے پوچھا۔

بڑی حد تک جمیل نے کہا لڑکی کو ایم ایس سی کرایا گھر پر آرٹس کی تعلیم دی۔ موسیقی، مصوری، ابتدائی تعلیم پھر خانہ داری۔ سینا پرونا۔ اس نے اسماء کو بہت کچھ سکھایا۔ لیکن جمیل نے ایک لمبی آہ بھری اور خاموش ہوگیا۔

لیکن کیا؟ میں نے پوچھا۔

محلے میں اور جوان لڑکیاں بھی تھیں لیکن آغا انہیں پسند نہیں کرتا تھا اس لیے کہ ان میں دکھاوا تھا۔ شوخی تھی۔ فیشن تھا سب ملمع ہی ملمع وہ کہا کرتا تھا۔ جمیل ہنسنے لگا۔ سارے محلے میں اسماء کے سگھڑ پنے اور کردار کی دھوم تھی۔ محلے والے اسماء کی مثال دیا کرتے تھے۔

ہُوں یہ بات ہے میں نے کہا۔

لیکن جمیل نے سلسلہء کلام جاری کیا اسماء کے لیے کوئی پیغام نہ آیا اس کے برعکس محلے کی دوسری لڑکیاں باری باری سب لگ گئیں سب کی شادیاں ہوگئیں صرف اسماء رہ گئی۔

لیکن کیوں! میں نے پوچھا۔

پتہ نہیں کیوں؟ بڑے سب اسماء کے حق میں تھے اور نوجوان اگرچہ اس کے معترف تھے لیکن اس سے شادی کرنے کے لیے تیار نہ تھے اسلم نے تو صاف انکار کر دیا تھا۔ اس نے اپنی امی سے کہا تھا کہ وہ تو نمازیں پڑھتی ہے پھر یہ بات سارے محلے میں مشہور ہوگئی تھی حتیٰ کہ آغا نے اسماء کو نماز پڑھنے سے منع کر دیا تھا۔ جمیل خاموش ہوگیا اور سگریٹ کے کش لینے لگا۔

لیکن تم تو کہتے تھے میں نے پوچھا تمہاری شادی اسماء سے ہوتے ہوتے رہ گئی۔

ہاں وہ بولا۔ امی۔ ابا کی بڑی خواہش تھی کہ میری شادی اسماء سے ہوجائے۔

اور تمہاری اپنی خواہش نہ تھی کیا؟ میں نے پوچھا۔

میری خواہش بھی تھی اس میں بڑے گُن تھے اس میں مٹھاس تھی، ساتھی بننے کی صلاحیت تھی۔ خدمت کا جذبہ تھا۔ بڑی معصومیت تھی اس میں ہر وہ گن موجود تھا جو جیون

ساتھی میں ہونا چاہیے۔

پھر بات ٹوٹ کیوں گئی؟ میں نے پوچھا۔

انہی دنوں مجھے شہناز مل گئی اس میں اتنی بھڑک تھی کہ میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں اور میں شہناز کا ہو کر رہ گیا۔ جمیل خاموش ہو گیا۔ کافی دیر تک خاموشی سے سگریٹ کے کش لگاتا رہا۔ پھر بولا دراصل اسماء ایک دیا تھی جو مدھم لو سے جلتا تھا۔ اس میں بھڑک نہیں تھی اور ہم بھڑک کے دلدادہ ہیں وہ پھر خاموش ہو گیا۔ پھر آپ ہی آپ گنگنانے لگا جیسے اپنے آپ سے کہہ رہا ہو کہ کاش میں شہناز سے نہ ملتا۔

اسی سال مجھے پھر امرت پورن جانے کا اتفاق ہوا جب گاڑی پلیٹ فارم میں داخل ہوئی تو میں نے دیکھا کہ آغا اپنی مخصوص بنچ پر موجود نہ تھا اس کی جگہ ہپیوں کا ایک جوڑا بیٹھا تھا۔

خیر میں گاڑی سے نیچے اُترا جب میں پلیٹ فارم کے دروازے کے قریب پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ہپیوں کا جوڑا میرے سامنے کھڑا ہے۔ ہپی نے سر پر ہیٹ پہنا ہوا تھا ہپن کے بال کھلے تھے اور جسم پر ایک لمبا چغا تھا۔

ہپی نے ایک چھپا ہوا کارڈ میرے سامنے کر دیا اس پر لکھا تھا مسٹر آرتھر جیک اور مس ''آئی۔ وی'' امرت پورن کے مستند گائیڈ ہیں۔ کارڈ پڑھ کر ہپی کو واپس کرتے ہوئے میں نے پہلی بار غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ارے آغا۔۔۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ساتھ ہی میری نگاہ اسماء پر پڑی جو اس وقت کارٹون لگ رہی تھی۔ یہ آپ کی بیٹی اسماء اور آپ آغا ہیں نا۔

نہیں آغا نے جواب دیا۔ میں آغا نہیں ہوں میں آرتھر جیک ہوں اور یہ میری بیٹی مس آئی وی ہے ہم کنورٹ ہو گئے ہیں سر۔

یہ کہتے ہوئے آغا کی آنکھیں بھر آئیں اور آنسو ڈھلک کر اس کے چہرے کی جھریوں میں اٹک گئے۔

-☆-

ہانٹڈ ہاؤس

ڈاکٹر نے پوچھا مونا ڈر تو نہیں گئی۔

میں جواب دینے ہی والی تھی کہ ڈیڈ بولے نہیں ڈرنے کی کیا بات ہے۔

یہ سن کر میں تو چپ ہی ہو گئی میں کیا بولتی بھلا۔

ڈیڈی کو کیا پتہ کہ یہ گھر ہانٹڈ ہے۔ کسی کو بھی تو نہیں پتہ۔ کوئی بیک یارڈ میں گیا ہو تو پتہ چلے نا۔ کوئی بھی تو نہیں جاتا اُدھر۔ ممی جو کہتی ہے سرونٹ کوارٹرز کی طرف نہیں جانا۔ اِٹ از ناٹ ڈن۔

حسنے کے کوارٹر کے سامنے جو امرود کا پیڑ ہے اور پیڑ کے عین نیچے جو ٹوٹی ہوئی کرسی رکھی ہوئی ہے نا وہ اس پر بیٹھا رہتا ہے۔ میں نے تو کئی بار دیکھا ہے اسے۔ ایک بار نہیں کئی بار۔

اُس نے سفید جوڑا پہن رکھا ہوتا ہے۔ چِٹا سفید اس کا اتنا بڑا فیس ہے چوڑا لمبا۔ سارا کا سارا جھریوں سے بھرا ہوا۔ جھریاں ہی جھریاں نیچے سے اُوپر تک تہیں لگی ہوئی ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے ان میں جان ہو۔ پھیلتی سمٹتی رہتی ہیں نا۔ رینگتی ہیں۔ جس طرح تالاب میں پتھر مارو تو لہریں رینگتی ہیں۔۔۔ اور پھر اس کی اتنی لمبی داڑھی۔ اوپر سے چل کر نیچے چھاتی تک داڑھی ہی داڑھی چِٹی سفید داڑھی۔

کُرسی میں بیٹھے ہوئے وہ اُونگھتا رہتا ہے۔ ذرا آہٹ ہو تو آنکھیں کھول دیتا ہے اور اس کی آنکھوں میں اتنی افیکشن ہے اتنی افیکشن ہے جتنی رضیہ کی آنکھوں میں چمکتی ہے جب وہ اپنی بیٹی نامو کی طرف دیکھتی ہے۔ رضیہ ہمارے پڑوسی کی میڈ سرونٹ ہے نا۔

میں تو اس سے کبھی نہ ڈری تھی۔۔۔ ایسے چِٹے سفید روئی کے گالے بابے سے بھلا

کون ڈرتا ہے۔ اُلٹا وہ مجھے دیکھ کر گھبرا جاتا ہے۔ کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ مدھم آواز میں پوچھتا ہے مس صاحبہ۔ صاحب نے بلایا ہے کیا۔ میں آؤں۔

جب مَیں نہ میں سر ہلا دیتی ہوں تو اس کی روشن آنکھیں بجھ جاتی ہیں۔ اچھا نہیں بُلایا۔

وہ تو وہاں صرف اس اُمید پر بیٹھا ہے کہ صاحب بُلا لے۔ ایسے بابے سے بھلا کون ڈرے۔

مصیبت یوں آئی کہ میں حسنے سے پوچھ بیٹھی۔ نہ پوچھتی تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ نہ میں ڈرتی نہ مجھے بخار آتا۔ نہ ڈاکٹر کی کڑوی دوائیں کھانی پڑتیں۔ اور حسنے سے میں نے پوچھا بھی تو بائی دی وے تھا۔

میں نے کہا حسنے۔ تیرے کوارٹر کے سامنے امرود کے پیڑ کے نیچے جو بابا بیٹھا رہتا ہے وہ تیرا کچھ لگتا ہے کیا۔

حسنے نے حیرانی سے میری طرف دیکھا۔ کون سا بابا مس صاحبہ۔

وہی جو سفید کپڑے پہنے ٹوٹی ہوئی کرسی پر بیٹھا رہتا ہے۔

نہیں مس صاحبہ اس نے جواب دیا۔ میں نے تو وہاں کبھی کسی بابے کو بیٹھے نہیں دیکھا۔

یہ سن کر میری تو جان ہی نکل گئی۔

بس اس روز سے مجھ پر خوف طاری ہو گیا۔ اسی شام جب میں بستر پر لیٹی ہوئی تھی تو میں نے سوچا ایک بار پھر دیکھوں تو۔

میرے باتھ روم کا روشندان بیک یارڈ میں کھلتا ہے۔ میں نے اٹھ کر روشندان سے جھانکا۔ کیا دیکھتی ہوں کہ بابا کرسی پر جوں کا توں بیٹھا ہے۔۔۔ اور اس کے پاس ہی جائے نماز بچھا ہوا ہے۔

یہ دیکھ کر میری تو ٹانگیں کانپنے لگیں اور پھر پھونک کر بخار چڑھ گیا۔

اس روز کے بعد میں کبھی بیک یارڈ میں نہیں گئی۔ نہ ہی میں نے کبھی باتھ روم کے روشندان سے جھانکا ہے۔ لیکن رات کو جب میں بیڈ پر لیٹتی ہوں تو میرے دل میں خوف

اٹھتا ہے کہ وہ ابھی باتھ روم کے روشندان سے جھانکے گا۔ اس پر میں لپک کر اٹھتی ہوں اور روشندان کا دروازہ بند کر دیتی ہوں۔ پھر آہستہ آہستہ میرے کمرے کی وہ دیوار جو بیک یارڈ کی طرف ہے یوں گھل جاتی ہے جیسے بتاشہ ہو اور بیک یارڈ میرے سامنے آ جاتا ہے۔ پھر دفعتاً وہ مڑ کر میری طرف دیکھتا ہے۔ مس صاحبہ، صاحب نے بلایا ہے کیا۔ میں آؤں۔

میں چیخ کر اٹھ بیٹھتی ہوں۔

آپ ہمارے گھر کو نہیں جانتے۔

ہمارا گھر اصولی گھر ہے۔ یہاں اصول چلتے ہیں۔ کیا کہتے ہیں اسے۔۔۔ ہاں صراطِ مستقیم۔ بس یہ سمجھ لو کہ ہمارا گھر صراطِ مستقیم ہے مذہب والا نہیں، سوشل والا صراطِ مستقیم۔ ہمارا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، ہنسنا رونا سب سوشل رنگ میں رنگا ہوا ہے۔

یوں سمجھ لو کہ سوشل سڑک پر ہمارا گھر دو پہیوں پر چلتا ہے۔۔۔ ڈن۔۔۔ ناٹ ڈن جو فیشن میں ہے وہ ڈن ہے اس لیے کرو۔ فوراً کرو۔ بھول چوک کی اجازت نہیں۔ جو ناٹ ڈن ہے۔ وہ نہیں ہوگا۔ نہیں ہوسکتا اس لیے مت کرو۔ وہ ٹیبو ہے۔ ٹیبو۔

اس بات میں ممی نے ہمیں بہت ٹرینڈ کیا ہے۔ بات بات پر وہ ہمیں یاد دلاتی رہتی ہیں۔ بچو مت کرو اِٹ اِز ناٹ ڈن۔

ہم چار بھائی بہن ہیں۔ میں ہوں سنبھہ ہے۔ ٹونی ہے اور بڑے بھائی جان آصف ہیں۔ بچپن سے ہی ہم ہر بات پر سوچتے ہیں کہ کہیں یہ ناٹ ڈن تو نہیں۔ ناٹ ڈن پر تو ممی ڈیڈ کو بھی ڈانٹ دیتی ہیں اور ڈیڈ نے کبھی برا نہیں مانا۔ بس پی جاتے ہیں۔ ایک دفعہ ڈیڈ اپنے کسی دوست کو اپنے بیڈ روم میں لے گئے تھے۔ توبہ ڈیڈی کو ممی سے جان چھڑانی مشکل ہوگئی تھی۔

دراصل ممی چاہتی ہے کہ وہ سوشل سیڑھیوں پر چڑھتی جائے ذرا دم نہ لے۔ جبھی تو پچھلے پانچ سال میں ہم کہاں سے کہاں آ پہنچے ہیں۔ ورنہ ہیں تو دونوں ہی گاؤں کے ڈیڈ بھی ممی بھی جبھی تو وہ پاسٹ کو بھول جانا چاہتی ہے۔ سب ریلیشنز کو چھوڑ دیا۔ نہ میل نہ ملاپ نہ آنا جانا نہ لینا دینا۔ جبھی تو ہمارے گھر نہ کبھی کوئی کزن آیا ہے نہ انکل نہ آنٹی۔

ہمارا گھر تو ٹک ٹک قسم کا گھر ہے آپ ہی آپ چلتا ہے جیسے گھڑی چلتی ہے۔ چیزیں اپنی اپنی جگہ یوں قائم رہتی ہیں جیسے کیل ٹھکے ہوئے ہوں۔ کیا مجال جو اِدھر کی چیز اُدھر ہو جائے۔ کیا مجال جو کوئی نوکر کو آواز دے کر بلائے۔ نو۔ نو۔ گھنٹی بجاؤ۔ کیا مجال جو ہمارا کوئی فرینڈ ہمارے بیڈ روم میں چلا جائے۔ نو۔ نیور۔

ساری غلطی ڈیڈ کی تھی۔ وہی اس بڈھے بابے کو انگلی لگا کر گھر میں لے آئے تھے۔

اس روز حسنا چھٹی پر تھا۔ ڈوربل جو ہوا تو خود میں نے جا کر دروازہ کھولا۔ ویسے تو یہ ناٹ ڈن بات تھی۔ میں نے دروازہ کھولا تو ڈیڈ اندر آ گئے۔

ارے یہ ڈیڈ نے بڈھے بابے کو کیوں انگلی لگا رکھی ہے۔ میں حیران مائی گاڈ واٹ از دس تھنگ۔ چٹی سفید داڑھی۔ کھڑ کھڑ کرتی شلوار قمیض۔

میں سوچنے لگی۔ رشتے دار تو ہو نہیں سکتا۔ سوشل وزیٹر بھی نہیں۔۔۔ پھر یہ ہے کون مائی گاڈ یہ کیا۔

ڈیڈ بڈھے کو بیڈ روم کی طرف لے جا رہے تھے۔ نو نو نو۔۔۔ بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ اِٹ از ناٹ ڈن۔

لیکن اس روز بھی ابنارمل ہو رہے تھے۔

یہ اس روز کی بات ہے۔ جس روز پی آئی اے کا طیارہ ہائی جیک ہوا تھا اور فضائی ڈاکو اسے پشاور کی جگہ کابل لے گئے تھے۔

جب ہم نے خبر سنی تھی تو ہمارے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ ممی کا تو بہت برا حال تھا۔ ڈیڈی اسے حوصلہ دیتے لیکن ممی کی حالت غیر ہوتی جاتی۔

ویسے تو اس واقعہ پر ہر کسی کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ ہر کوئی ان غنڈوں کے خلاف دانت پیس رہا تھا۔ اس روز تو ہر کوئی ریڈیو، ٹیلی ویژن پر خبروں کا انتظار کر رہا تھا۔ بھئی یہ ایک قومی حادثہ تھا نا۔

لیکن ہم پر یہ خبر بجلی بن کر اس لیے گری تھی کہ میرا بڑا بھائی آصف اسی جہاز پر سوار تھا نا۔

ممی کا تو رو رو کر بُرا حال ہو گیا تھا۔ آنکھیں سوج گئیں۔ آواز بیٹھ گئی اور وہ لونج سے اُٹھ کر بستر پر جا پڑیں۔ جب ڈیڈ بڈھے بابے کو بیڈروم میں لے گئے تو میں نے سوچا۔ ممی بُری طرح سے جھاڑ جھپٹ کریں گی۔ ڈر کے مارے مَیں تھر تھر کانپتی رہی۔ لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔ ممی کی آواز تک نہ آئی۔ ڈیڈ نے اندر سے دروازہ بند کرلیا اور کمرے پر گہری خاموشی چھا گئی۔

کچھ دیر کے بعد ممی کی آوازیں آنے لگیں۔ آہستہ آہستہ مدھم جیسے کوئی زیرِلب منتیں کر رہا ہو۔ میں بہت حیران ہوئی ممی کس کی منتیں کر رہی ہے۔ ممی اور منت۔ اُوں ہُوں ممی نے تو کبھی کسی کی منّت نہیں کی۔ اس کی گردن تو ہمیشہ اکڑی رہتی ہے۔ وہ تو ڈیڈی کے سامنے بھی نہیں جھکتیں یہ جاننے کے لیے کہ بات کیا ہے میں نے ٹونی کو پٹی پڑھائی کہ اندر جا کر دیکھے۔

ٹونی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ڈیڈی نے دروازہ کھولا لیکن ٹونی کو اندر داخل ہونے نہ دیا۔ بولے اس وقت نہیں ٹونی تمہاری ممی کی طبیعت اچھی نہیں۔ ٹونی نے کہا باجی میں نے ادھ کھلے پٹ سے دیکھ لیا۔ درمیان میں بڈھا بابا بیٹھا ہے۔ اِدھر ممی اُدھر ڈیڈی۔

اس رات دیر تک ممی کی سسکیوں کی آوازیں آتی رہیں۔

اگلے روز ایک عجیب بات ہوئی۔ حسنا بازار سے سودا لایا تو اس کے ہاتھوں میں پلاسٹک کے دو لوٹے تھے۔

میں نے حیرت سے پوچھا۔ حسنے یہ لوٹے کس لیے ہیں۔ بولا مس صاحبہ بیگم صاحبہ نے منگوائے ہیں۔ ممی لوٹا منگائے۔ اُوں ہُوں یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ میں نے سوچا۔

مجھے یاد ہے ایک سال پہلے جب ہم نے یہ والا مکان کرائے پر لیا تھا تو گھر میں پہلے سے ہی پلاسٹک کا کورا لوٹا پڑا تھا۔

ممی نے کہا یہ لوٹا حسنے کو دے دو اس کے کام آئے گا۔

میں نے کہا ممی رہنے دو۔ ہمارے کام کا ہے۔

اس پر ممی پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ گئی۔ نو ناٹ لوٹا۔ جگ منگوا لو مگ منگوا لو۔ ناٹ

لوٹا اِٹ اِز ناٹ ڈن۔

اور۔۔۔آج ممی نے خود لوٹے منگوائے ہیں۔ایک نہیں دو۔ یہ ناٹ ڈن کیسے ڈن ہو گیا بھلا۔

پھر اُسی شام ہمارے پڑوسی کی میڈ سرونٹ رضیہ دو چھوٹے چھوٹے غالیچے دے گئی۔

یہ کیا چیز ہے۔میں نے پوچھا۔

بولی یہ جاءنماز ہیں۔بیگم صاحبہ نے منگوائے ہیں۔

اسی رات میں نے ممی کے دروازے کے کی ہول سے جھانکا ممی غالیچے پر کھڑی تھی اور وہ بڈھا بابا آنکھیں موندھے کُرسی پر بیٹھا تھا۔ بڈھے کی بے بسی دیکھ کر مجھے ایسا لگا جیسے ممی ڈیڈ نے اسے ہائی جیک کر رکھا ہے۔

ممی کو نماز پڑھتے دیکھ کر مجھے بڑا غصہ آیا۔ یہ کیا تماشہ لگا رکھا ہے۔سارے ہی ناٹ ڈن۔ڈن ہو گئے۔ممی کی تو سمجھو دنیا ہی بدل گئی۔ یوں سادمرادی ہو گئی کہ کچھ حد نہیں نہ پاؤڈر نہ سُرخی نہ لپ سٹک۔نہ میک اپ، نہ ہیر ڈو، نہ زیور، نہ کچھ۔ڈریس بدل گیا۔دوپٹہ ماتھے پر لٹکنے لگا۔سارے سوشل وزٹ منسوخ ہو گئے۔کوئی آتا تو ریگریٹ کر دیتے۔ممی بیڈ ریسٹ پر ہیں ڈیڈی گھر پر نہیں۔حالانکہ دونوں اندر ہوتے۔ ہر وقت اندر ہی گھُسے رہتے۔

جس روز ہائی جیکرز نے نوجوان اہلکار کو گولی مار کر ہلاک کیا تھا۔اُس روز تو ممی کے کمرے سے خوفناک آوازیں آتی رہی تھیں۔ہچکیاں، سسکیاں اور دبی دبی چیخیں۔توبہ ہے۔دو دن ہمارے گھر کی حالت غیر رہی۔

پھر دفعتاً خبر آئی کہ ہائی جیکرز نے مسافروں کو آزاد کر دیا ہے۔ یہ خبر سن کر ممی ڈیڈ کمرے سے باہر نکل آئے اور ٹی وی کے سرہانے بیٹھ گئے۔ بیٹھے رہے حتیٰ کہ خبر کی تصدیق ہو گئی۔

اُسی شام ڈیڈ ممی ہوائی جہاز میں بیٹھ کر بھائی کو ریسیو کرنے کراچی چلے گئے اور ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔ پتہ نہیں وہ بڈھا بابا کب بیڈ روم سے باہر نکلا۔ میں نے اسے نکلتے دیکھا نہیں۔

چار ایک دن کے بعد ممی ڈیڈی آصف بھائی کو ساتھ لے کر آ گئے۔ ہم تو بھائی کو دیکھ کر کِھل گئے۔ پورے چار دن بھائی یہاں رہے۔ تو بہ بھائی کی گپیں اور چھیڑ خانیاں اور لطیفے اور اُلٹی سیدھی باتیں۔ اتنا ہنگامہ رہا کہ وقت کا پتہ ہی نہ چلا۔ اتنی رونق رہی کہ کچھ حد نہیں۔ پھر وہ چلے گئے اور گھر پھر سے وہی گھر بن گیا۔

ممی پھر سے وہی ممی بن گئیں اور ڈن اور ناٹ ڈن پھر سے قائم ہو گئے۔ لوٹے غائب ہو گئے۔ چھوٹے غالیچے صندوق میں بند ہو گئے۔ قرآن الماری میں رکھ دیا گیا۔ ممی کا بیڈ روم پھر سے پراپر بیڈ روم بن گیا۔ میک اپ کا سامان باہر نکل آیا۔ شلوار قمیض غائب۔ دوپٹہ پتہ نہیں کیا ہوا۔ سوشل وزٹس پھر سے چالو ہو گئے۔ اور ہمارا گھر پھر سے گھڑی کی طرح ٹک ٹک کرنے لگا۔ اور وہ بابا ہمارے ذہن سے بالکل ہی خارج ہو گیا۔

پھر ایک دن ٹونی میرے پاس آیا کہنے لگا باجی ہماری شٹل کاک بیک یارڈ کے روشندان میں پھنس گئی ہے ذرا نکال دیجیے۔

بیک یارڈ میں گئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ حسنے کے کوارٹر کے سامنے امرود کے پیڑ تلے وہی بابا ایک ٹوٹی ہوئی کُرسی پر بیٹھا اُونگھ رہا ہے۔

مائی گاڈ یہ یہاں کیوں بیٹھا ہے۔

میرے قدموں کی آہٹ سن کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ مؤدبانہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ بولا مس صاحبہ کیا صاحب نے بُلایا ہے۔ میں آؤں۔

اس پر میں ہکّی بکّی رہ گئی۔ لو صاحب اسے کیوں بلائیں گے بھلا خواہ مخواہ۔

اس کے بعد جب بھی میں بیک یارڈ میں گئی تو میں نے اسے وہیں بیٹھے دیکھا۔ اس پر میں سمجھی کہ یہ بابا ضرور حسنے کا کچھ لگتا ہو گا۔

ہمارا نوکر حسنا بھی تو پرانی وضع کا آدمی ہے۔ بس سارا دن یا تو وضو کرتا رہتا ہے یا نمازیں پڑھتا رہتا ہے۔ پینڈو ہے نا اس لیے۔

وہ تو مجھ سے غلطی ہو گئی کہ میں حسنے سے پوچھ بیٹھی۔ نہ پوچھتی تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ نہ میں ڈر کے مارے تھر تھر کانپتی، نہ مجھے بخار آتا۔

میں کہتی ہوں وہ اب بھی وہاں بیٹھا ہے۔

وہ ہر آہٹ پر چونک اُٹھتا ہے۔ صاحب نے بُلایا ہے کیا۔۔۔ میں آؤں۔

مائی گاڈ وہ اتنا بے چین کیوں ہے کہ صاحب اسے بلائے۔۔۔ کیا وہ یونہی ہمارے گھر کو ہانٹ کرتا رہے گا۔

☆

ایک تھا بادشاہ

ایک تھا بادشاہ۔ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ۔ بادشاہ کا نام اسادا تھا۔

جب اسادا بوڑھا ہو گیا تو اسے یہ فکر دامن گیر ہوئی جیسے کہ ہر بادشاہ کو ہوتی ہے کہ کہیں راج پاٹ اس کے ہاتھ سے نکل نہ جائے۔

بادشاہ اسادا سوچ سوچ کر ہار گیا کہ کون سا طریقِ کار اختیار کرے۔ چونکہ بادشاہ تھا لہٰذا کسی سے مشورہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ دل کی بات کسی سے کہہ نہیں سکتا تھا۔ بادشاہ، لقمان کے اس کوے کا مصداق ہوتا ہے جو منہ میں پنیر کا ٹکڑا پکڑے درخت پر بیٹھا ہو۔ درخت کے نیچے مشیر، وزیر کھڑے یک زبان ہو کر کہہ رہے ہوں ''شاہ عالم آپ کتنے خوش گفتار ہیں۔ بولتے ہیں تو پھول جھڑتے ہیں''۔ پھول جھڑیں یا نہ جھڑیں پنیر کا ٹکڑا منہ میں ہو تو کیسے بات کرے۔

شاہ اسادا کا وزیر بڑا باتدبیر تھا۔ جیسے وزیر ہمیشہ ہوتا ہے۔ اس حد تک باتدبیر تھا کہ بادشاہ خود اس کی باتدبیری سے خوف زدہ تھا۔

وزیر، بادشاہ کی فکرمندی کو بھانپ گیا۔ ایک روز موقع پا کر تخلیے میں بولا: ''عالی جاہ! میری گردن کاٹنے کا حکم صادر فرمائیے۔'' بادشاہ یہ سن کر بہت حیران ہوا۔ بولا ''تم نے کون سا جرم کیا ہے کہ میں ایسا حکم صادر کروں۔''

وزیر بولا ''شاہ عالم، اگر بادشاہ سلامت کی پیشانی پر فکرمندی کی سلوٹیں موجود ہوں تو بے شک وزیر گردن زدنی ہوتا ہے۔ عالی جاہ سیانے کہتے ہیں۔ اگر کوئی بات چھپانی مقصود ہو تو اسے ایسے چھپاؤ کہ برتاؤ کے کسی دریچے سے جھانکنے نہ پائے۔ اور اگر جھانکے تو پھر

چھپانا سعی لاحاصل ہے۔ اور عالم پناہ! بادشاہ سلامت کو سعی لاحاصل زیب نہیں دیتی۔"

اب بادشاہ کے لیے کوئی چارہ نہ رہا۔ بولا "وزیر با تدبیر ہم چاہتے ہیں کہ جیتے جی راج پاٹ اپنے بڑے بیٹے کو سونپ کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔"

وزیر نے جواب دیا "عالی جاہ! اس میں فکرمندی کی کیا بات ہے۔ "حکم دیجیے تعمیلِ ارشاد ہو گی۔"

بادشاہ نے کہا "وزیر با تدبیر ہم جاننا چاہتے ہیں کہ اس بارے میں تمہاری کیا رائے ہے۔"

وزیر بولا "شاہ عالم! ویسے تو حکم پر سرِ تسلیم خم ہے۔ لیکن سیانے کہتے ہیں کہ بادشاہ کا بیٹا نہیں ہوتا، شہزادہ ہوتا ہے۔ اور شہزادے کا باپ نہیں ہوتا بادشاہ ہوتا ہے۔ آگے آپ مالک ہیں۔"

یہ سن کر بادشاہ گھبرا گیا۔ لیکن خاموش رہا۔

وزیر نے اپنی بات جاری رکھی۔ کہنے لگا "عالی جاہ! شہزادہ ساجھانا گزشتہ آٹھ سال سے یورپ میں یونیورسٹی آف ویسٹرن آرٹس اینڈ سائنس میں زیرِ تعلیم ہے۔ شہزادے کی تاجپوشی کا اعلان کرنے سے پہلے ان کا عندیہ معلوم کرنا مناسب رہے گا۔ حکم ہو تو شہزادہ سلامت کو بلانے کے لیے ایلچی روانہ کر دیا جائے۔"

شہزادے کی آمد کے بعد بادشاہ اور وزیر یہ جان کر حیران رہ گئے کہ ساجھانا کسی صورت بادشاہ بننے پر رضامند نہ تھا۔

اس میں شہزادے کا کوئی قصور نہ تھا۔ سالہا سال مغربی یونیورسٹی میں تعلیم و تربیت پانے کے بعد وہ بادشاہ کے نام سے ہی الرجک ہو چکا تھا۔

وزیر بولا "شہزادہ سلامت! آپ کتاب و شنید کے چکر میں آ چکے ہیں۔ یہ کتابی علم جو درس گاہوں میں رائج ہے عملی زندگی میں نہیں چلتا۔

شہزادے نے جواب دیا "محترم وزیر! بادشاہ پرانے زمانے کی چیز ہے۔ وہ مدت سے مر چکا ہے۔ آپ مجھے بادشاہ بنا کر مرحوم و مغفور نہ کریں۔ میں زندہ رہ کر زندگی گزارنا

چاہتا ہوں۔''

وزیر بولا ''شہزادہ عالی! یہ کہنا کہ بادشاہ مر چکا ہے ایک کتابی خوش فہمی ہے۔ عملی زندگی میں وہ آج بھی جوں کا توں زندہ و پائندہ ہے۔ میں جانتا ہوں کہ بادشاہ نے بھیس بدل لیا ہے خود کو کیما فلاج کر لیا ہے۔ کہیں وہ سفید کپڑوں میں چھپا بیٹھا ہے کہیں خاص قسم کے لباس میں۔ کہیں نمائندے کا سوانگ رچائے بیٹھا ہے کہیں سامراجی طاقتوں کے خلاف نعرے لگا رہا ہے۔ کہیں عوام کی محبت کی بھبھوت ملے بیٹھا ہے۔ کہیں خدمتِ خلق کا رُوپ دھارے ہوئے ہے۔ شہزادہ سلامت! یاد رکھیے کہ بھیس بدلنے سے کردار نہیں بدلتا۔''

''یہ بھیس بدلنے کی رسم بھی نئی نہیں'' بادشاہ نے کہا ''بلکہ صدیوں پرانی ہے۔ پرانے زمانوں میں بھی بادشاہ بھیس بدل کر شہر میں گھوما کرتے تھے کہ عوام سے رابطہ قائم ہو۔''

وزیر نے بادشاہ کی بات کاٹی۔ بولا ''گستاخی معاف عالم پناہ! لیکن یہ وضاحت ضروری ہے کہ بادشاہ عوام سے رابطہ پیدا نہیں کرتے بلکہ کوشش کرتے ہیں کہ ایسا طرزِ عمل اپنائیں کہ عوام سمجھیں کہ وہ ان سے رابطہ پیدا کرنے کے خواہش مند ہیں۔''

بادشاہ نے بات کا رخ بدلنے کے لیے کہا ''شہزادہ ساجھانا! تم اپنے چچا آدورا کی مثال سامنے رکھو۔''

''چچا تو بادشاہ نہ تھے۔'' ساجھانا بولا ''وہ تو عوام کے منتخب نمائندے تھے۔''

''بے شک بے شک آپ درست فرماتے ہیں شہزادہ سلامت!'' وزیر باتدبیر نے حامی بھری ''عوام آج بھی یہی سمجھتے ہیں کہ شاہ آدورا بادشاہ نہ تھے اور وہ کوئی کام عوام کی مرضی پوچھے بغیر نہ کرتے تھے۔ عالی جاہ! بادشاہ کی کامیابی کا راز یہی ہے کہ وہ بادشاہ تو ہو لیکن عوام سے بادشاہ نہ سمجھیں۔''

''بے شک بے شک۔'' شاہ نے وزیر پر تحسین بھری نگاہ ڈالی۔

وزیر نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ بولا ''شاہ آدورا عوام کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے لیکن ان کی نظر میں ایسا جادو تھا کہ وہ محبت سے بھری ہوئی نظر آتی تھی۔ جب وہ زبان کی لاٹھی چلاتے تو عوام فرطِ محبت سے دم ہلانے پر مجبور ہو جاتے۔''

شہزادہ اپنے چچا کا پرستار تھا، وزیر کی بات سُن کر اسے دھچکا لگا، بولا: بادشاہ سلامت!
"سفر کی کوفت کی وجہ سے میں بہت تھک گیا ہوں اجازت ہوتو ذرا آرام کرلوں۔"
ظاہر ہے کہ شہزادے پر پند ونصیحت کا کوئی اثر نہ ہوا تھا۔ وہ مغربی رنگ میں رنگا ہوا ایک نوجوان تھا۔

اسی رات جب بادشاہ، ملکہ اکلیمہ کے پاس پہنچا تو وہ ایک ہی نظر میں تاڑ گئی کہ سارنگی کے تار ڈھیلے پڑے ہوئے ہیں۔

ملکہ اکلیمہ بڑی سیانی تھی۔ ویسے تو ہر عورت سیانی ہوتی ہے۔ چونکہ اسے ایک ڈھکے چھپے ظلِ الٰہی کے ساتھ رہنا سہنا پڑتا ہے۔ رہنا کم سہنا زیادہ۔ لیکن ملکہ تو ایک ننگ دھڑنگ ظل الٰہی کے زیرِ سایہ تھی۔ اس لیے کچھ زیادہ ہی سیانی تھی۔ اس کے لیے زندگی گویا شطرنج کی بساط تھی۔ پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے۔ پر ایسا ہوتا ضرور ہے۔ کششِ ثقل کی روک نہ ہوتو بوٹا اُگ نہیں سکتا۔ بندشوں کے کانٹے نہ ہوں تو گلاب پھول نہیں سکتا۔

خیر بادشاہ کو دیکھتے ہی ملکہ سمجھ گئی کہ پیشانی کی سلوٹوں میں دبی ہوئی بات ہونٹوں پر اترنے والی ہے۔ لہٰذا وہ رنگ روپ ناز نخرے کے پیادے چلانے میں مصروف ہوگئی۔

جس طرح عورت کا کام یہ ہوتا ہے کہ مرد سے معتبری کا چھلکا اتار کر اندر سے کھلنڈرا بچہ نکال لے۔ اسی طرح ملکہ کا کام یہ ہوتا ہے کہ ظلِ الٰہی کا پتھر توڑ کر اندر کا انسان باہر نکالے۔ انسان باہر نکلا تو اس نے ساری بات ملکہ سے کہہ دی۔

شاہ کی بات سن کر ملکہ بولی: "عالی جاہ! بادشاہت ایک میوہ ہے، ایک بار اس کا سواد چکھ لو تو منہ کو لگ جاتا ہے۔ پھر چھوڑنے سے نہیں چھوٹتا۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ شہزادہ بادشاہ بننا قبول کرلے تو پہلے اس میں بادشاہ بننے کی آرزو پیدا کیجیے۔ پھل کا سواد چکھائیے۔ چاٹ لگائیے۔"

"سواد کیسے چکھائیں؟" بادشاہ نے پوچھا۔

پہلے اسے جلسے جلوسوں میں لے جائیں۔ محل سے نکلے تو طوطیاں بجیں۔ بازاروں سے گزرے تو سیکیوریٹی کی موٹریں، چلاؤں چلاؤں کرتی ہوئی آگے آگے دوڑیں۔ ٹریفک

بند ہو جائے۔ پولیس والے راستے روک کر کھڑے ہو جائیں۔ راہ چلتوں کو روک کر زبردستی دو رویہ کھڑا کر دیں جیسے وہ خیر مقدم کے لیے گھر سے نکلے ہوں تا کہ شہزادہ سمجھے کہ وہ لوگ نہیں پروانے ہیں۔ جلسوں میں پُر جوش استقبال ہوں۔ زندہ باد کے نعرے لگیں۔ پھول برسائے جائیں۔ فوٹو گرافر تصویریں کھینچیں۔ اخبار شہ سرخیاں سجائیں، تصویریں لگائیں۔ ریڈیو اور ٹی وی والے ان مصور خبروں کو دہرا دہرا کر ناظرین و سامعین کو مفرح کریں۔ لیکن ٹھہریئے۔ شاہ عالم، ملکہ رک گئی۔ ''پہلے اچھی طرح سوچ سمجھ لیجئے کیا شہزادے کو بادشاہ بنانے کا فیصلہ مناسب ہے۔''

اس پر بادشاہ کے پیشانی پر بل پڑ گئے بولا ''کیا مطلب ہے تمہارا ملکہ اکلیمہ؟''

ملکہ بولی: ''عالی جاہ! اگر شہزادے کے منہ کو بادشاہت کا سواد لگ گیا تو وہ بادشاہ بننے کے لیے اتنا بے صبرا ہو جائے گا کہ آپ نہ بنائیں گے تو بھی بننے کے خواب دیکھے گا۔ اور بن گیا تو وہ بیٹا بن کر نہیں جیے گا۔ ظلِ الٰہی سیانے کہتے ہیں، ''شیر اس وقت تک شیر نہیں بنتا جب تک اس کے منہ کو خون نہ لگ جائے۔'' اس پر بادشاہ چپ ہو گیا۔ سوچ میں پڑ گیا۔

بہر صورت بادشاہ نے حکم صادر کر دیا کہ شہزادے کو جلسے جلوسوں میں گھمایا پھرایا جائے۔ وزیر باتدبیر بولا ''عالی جاہ! اگر نشر و تشہیر مقصود ہے تو بہتر ہو گا کہ آپ ذرائع ابلاغ کے محکمے والوں سے مل کر اپنا عندیہ بیان کریں۔

ذرائع ابلاغ کا سربراہ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو بادشاہ نے بر سبیل تذکرہ پوچھا آپ کا محکمہ کیا کام کرتا ہے؟'' اس پر سربراہ گھبرا گیا۔ بولا ''شاہ عالم جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔''

شاہ نے امان دے دی تو وہ بولا ''عالی جاہ! ہمارے دو کام ہیں، ایک یہ کہ بادشاہ کو حقیقتِ حال کی خبر نہ ہونے پائے۔ دوسرے یہ کہ عوام میں یہ گمان پیدا کیا جائے کہ انہیں صورتِ حال سے باخبر رکھا جا رہا ہے۔''

بادشاہ کی سمجھ میں بات نہ آئی، بولا ''بات ہمارے پلّے نہیں پڑی۔''

اس پر سربراہ کی باچھیں کھل گئیں۔ بولا ''عالی جاہ! یہی ہمارا کام ہے کہ بات کہہ دی

جائے لیکن پلّے نہ پڑے۔ عالی جاہ! ہم پر اعتماد کیجیے۔ ہم ٹیکنیکل ایکسپرٹ ہیں۔ کام خوش اسلوبی سے سرانجام دیں گے۔ صرف یہ فرما دیجیے کہ مقصود کیا ہے۔

بادشاہ نے جواب دیا: ''ہم چاہتے ہیں کہ شہزادے کے دل میں بادشاہ بننے کی آرزو پیدا ہو جائے۔

سربراہ یہ سن کر گھبرا گیا، بولا: ''شاہ عالم! یہ تو ایک خطرناک بات ہوگی۔ اس کے علاوہ یہ طریقِ کار پرانا ہے۔ جدید طریقہ یہ ہے کہ عوام پُر زور مطالبہ کریں کہ شہزادہ گدّی سنبھال لے۔ ان کے اس پُر زور مطالبے سے مجبور ہو کر شہزادہ تخت نشینی پر رضامند ہو جائے۔''

''آپ عوام کو رضامند کیسے کریں گے؟'' شاہ نے پوچھا۔

''عالی جاہ!'' سربراہ بولا ''عوام رضامند ہوں نہ ہوں۔ ہم بار بار اعلان کریں گے کہ عوام کا یہ مطالبہ ہے۔ اس بات کو اتنی بار دہرائیں گے کہ عوام سمجھنے لگیں گے کہ واقعی یہ ہمارا مطالبہ ہے اور یہ گمان کہ شہزادے نے ان کی خواہشات پر سرِ تسلیم خم کر دیا ہے، ان کے لیے کتنی تسکین کا باعث ہوگا۔''

تو جناب دفتر پہنچ کر سربراہ نے احکامات جاری کر دیئے کہ فی الفور ایسے اقدامات کیے جائیں کہ شہزادہ عوام کی آنکھوں کا تارا بن جائے۔ اس پر محکمے کے کارکن فوراً حرکت میں آ گئے۔ شہزادے کی تصاویر کھینچی گئیں۔ آرٹسٹوں نے ان تصاویر میں رنگ بھرے، آنکھوں میں سیکس اپیل پیدا کی۔ ساجھانا کی سپاٹ آنکھوں میں گلیڈ آئی چمکنے لگی، کھلی اور خالی پیشانی پر مردانہ گھوری آ بیٹھی۔ سیدھے ہونٹ خم آلود ہو گئے۔

اس کے بعد اخباروں اور رسائل کے نام ایک سرکلر آرڈر روانہ کیا جس میں ان تصویروں کی کاپیاں ملفوف تھیں تاکہ ان تصاویر کے علاوہ شہزادے کی کوئی اور تصویر اخباروں میں نہ چھپے۔ اخباروں میں ان تصاویر کو جو بھی لڑکی دیکھتی اسے ایسا لگتا جیسے شہزادہ اُس کی طرف دیکھ رہا ہے اور اس کی نگاہوں میں اس کے لیے ایک خاص الخاص پیغام ہے۔

اس کے فوراً بعد شہزادے کا ایک انٹرویو چھپا جسے محکمے والوں نے مرتب کیا تھا۔ ایک سوال کے جواب میں شہزادے نے کہا میں شاہی خاندان کی لڑکی سے نہیں بلکہ عوامی ورکنگ

وومن سے شادی کروں گا۔ میں ذات پات، عہدے، مرتبے کا قائل نہیں البتہ لڑکی سمارٹ ہو، ذہین ہو، کلچرڈ ہو۔ ضروری نہیں کہ خدوخالی یا گوری ہو۔

اس اعلان کے بعد شہزادے کے جلسوں اور جلوسوں میں لڑکیوں کی تعداد میں اس قدر اضافہ ہو گیا کہ مینا بازار کا شبہ پڑنے لگا۔

اُدھر وزیر باتدبیر نے شاہ کی خدمت میں گزارش کی کہ ''عالی جاہ! جلسے جلوسوں کا پروگرام لانگ رینج پروگرام ہے فوری نتائج کے لیے مناسب ہوگا کہ شہزادے کو سمجھانے بجھانے کے لیے ایک ٹیوٹر مقرر کر دیا جائے جسے عرفِ عام میں کمپینین کہا جائے تاکہ شہزادہ بدظن نہ ہو۔ میری رائے میں کمپینین مغربی رنگ میں رنگا ہوا ہو تاکہ شہزادے پر اثر انداز ہو سکے۔''

اس مقصد کے لیے محکمہ تعلقاتِ عامہ نے یونیورسٹی کے بہت سے پروفیسروں سے انٹرویو کیے اور آخر میں ایک دھیڑ عمر کی ڈپلومیٹک ریلیشنز کی ڈاکٹر مادام زبوری کو منتخب کر لیا گیا۔ فائنل اپروول کے لیے مادام کو بادشاہ کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔

بادشاہ نے پوچھا ''محترمہ! آج کل بادشاہ کے لیے سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے؟''

مادام بولی ''عالی جاہ! آج کے دور میں شاہوں کے لیے صرف ایک ہی مسئلہ ہے اور وہ ہے پاور پالیٹکس کا مسئلہ۔''

شاہ نے کہا ''بی بی بندھے ٹکے الفاظ میں بات نہ کر۔ یہ بتا کہ پاور پالیٹکس سے تیری کیا مراد ہے؟''

مادام بولی ''عالی جاہ! دنیا میں بادشاہوں کے لیے صرف ایک ہی مسئلہ ہے جو باوا آدم سے آج تک جُوں کا تُوں قائم و دائم ہے اور وہ ہے لاٹھی اور بھینس کا مسئلہ۔ پہلے یہ مسئلہ افراد تک محدود تھا پھر قبیلوں تک جا پہنچا اور آج کل اقوام پر حاوی ہو چکا ہے۔''

''وہ کس طرح؟'' شاہ نے مزید کریدا۔

مادام نے جواب دیا ''شاہ عالم! آج کی دنیا میں کچھ قومیں لاٹھی قومیں ہیں باقی بھینس قومیں ہیں۔ لاٹھی قوموں کی خواہش ہے کہ زیادہ سے زیادہ بھینسوں کو ہانک کر اپنے گلے میں

لے جائیں، ان کا دودھ پئیں، کھال سے اپنے لیے جوتے بنائیں۔ عالی جاہ! ہر بھینس کی خواہش ہے کہ وہ اپنے تحفظ کے لیے کسی لاٹھی قوم کو اپنا لے۔ لیکن در پردہ ہر بھینس قوم چاہتی ہے کہ وہ بھی لاٹھی قوم بن جائے۔''

''وہ کیوں؟'' بادشاہ نے پوچھا۔

مادام نے جواب دیا ''عالی جاہ! قدرت کا اصول ہے کہ ایٹ آر بی ایٹن اگر تم لاٹھی نہیں بنو گے تو یقیناً بھینس بنا لئے جاؤ گے۔''

وزیر باتدبیر جو اس دوران میں خاموشی سے مادام کی باتیں سنتا رہا تھا بولا ''مادام! بتائیے کہ بادشاہ کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟''

مادام بولی ''محترم! بادشاہ خود ایک لاٹھی ہے جو بظاہر عوام کو سہارا دیتی ہے لیکن در پردہ انہیں ہانکتی ہے۔''

بادشاہ یہ سن کر بہت خوش ہوا اور اس نے مادام کو شہزادے کا کمپینین مقرر کر دیا۔

جب بادشاہ کی والدہ راج ملکہ کو مادام کی تعیناتی کا علم ہوا تو اس نے احتجاج کیا۔ بولی ''بیٹے! تم نے مادام کو شہزادے کا ساتھی بنا کر اچھا نہیں کیا۔''

بادشاہ نے جواب دیا ''والدہ محترمہ! ہم نے مادام کو اس لیے متعین کیا ہے کہ وہ شہزادے کو سمجھائے بجھائے۔''

''ٹھیک ہے'' راج ملکہ بولی ''لیکن میں ڈرتی ہوں کہ وہ شہزادے کو زیادہ ہی نہ سمجھا دے۔''

شاہ، راج ملکہ کا اشارہ سمجھ گیا بولا ''والدہ محترمہ! مادام ادھیڑ عمر کی عورت ہے۔ شہزادے کی ماں بجا ہے۔''

''یہی تو ڈر ہے'' راج ملکہ بولی ''اگر وہ نوجوان ہوتی تو کوئی اندیشہ نہ تھا۔ ماں بجا عورت گود میں ڈالنے کا گر جانتی ہے۔ شہزادے کو راہِ راست پر لانا کچھ مشکل نہ تھا۔ اس کا بیاہ کر دیتے، شہزادہ چاہے بادشاہ بننے پر رضامند نہیں لیکن اس کی بیوی ملکہ بننے پر مچل جاتی پھر کوئی مسئلہ ہی نہ رہتا۔''

بادشاہ نے کہا ''آپ بجا فرماتی ہیں، ہم جلد از جلد شہزادے کے بیاہ کے انتظامات کر دیں گے۔'' اس پر راج ملکہ مطمئن ہو گئی۔

اُدھر شہزادے کو علم تھا کہ مادام اس کی اتالیق مقرر کی گئی ہے تاکہ اسے سمجھائے بجھائے۔ اس لیے اس نے مادام سے سرد مہری اختیار کر لی۔ مادام نے اس سرد مہری کو درخور اعتنا نہ سمجھا اور ایسا رویہ اختیار کر لیا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

شہزادہ آخر نوجوان تھا، کچا تھا، ایک روز پھوٹ پڑا۔ مادام سے کہنے لگا ''مجھے پتہ ہے آپ مجھے سمجھانے بجھانے پر مامور کی گئی ہیں۔''

''ہاں'' مادام نے اثبات میں سر ہلا دیا ''شاہ عالم یہی سمجھتے ہیں کہ میں شہزادہ سلامت کو سمجھانے بجھانے پر مامور ہوں۔''

یہ سن کر شہزادہ بوکھلا گیا۔ بولا ''اور آپ کیا سمجھتی ہیں۔''

مادام بولی ''میں نہیں چاہتی کہ آپ بادشاہ بننے پر رضا مند ہوں۔''

شہزادے نے حیرت سے مادام کی طرف دیکھا۔ مادام نے اپنی بات جاری رکھی۔ بولی ''شہزادہ سلامت! یہ بڑے بوڑھے ہم نوجوانوں کے راستے کی رکاوٹ ہیں۔ شہزادہ سلامت! میں جدید تعلیم سے آراستہ ہوں۔ مروجہ رسمی خیالات سے باغی ہوں۔''

حیرت سے شہزادے کی آنکھیں اُبل آئیں۔ بولا ''پھر آپ نے میری اتالیق بننا کیوں منظور کیا؟''

مادام نے جواب دیا ''پیارے شہزادے! مجھے آپ سے بے پناہ ہمدردی ہے۔ آپ کو بڑے بوڑھوں کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رکھنے کا صرف یہی طریقہ تھا کہ میں آپ کی اتالیق بن جاؤں۔''

شہزادے کی آنکھوں میں حیرت کی جگہ تحسین جھلکی اور وہ سرک کر مادام کے قریب تر ہو گیا۔۔۔ اس کے اردگرد ایک ممتا بھری گود پھیل گئی۔۔۔ پھیلتی گئی پھیلتی گئی۔ حتیٰ کہ مسلط و محیط ہو گئی۔

تین مہینے کے بعد اخبارات کے پہلے صفحے پر سیاہ حاشیے کے اندر جلی حروف میں خبر

چھپی کہ شاہ اسادا، شہزادہ ساجھانا اور ان کی اتالیق کے ہمراہ سیر و تفریح کے لیے ہل سٹیشن کی طرف جا رہے تھے کہ راستے میں اتفاقاً کار کا دروازہ کھل گیا۔ شاہ کار سے نیچے پھسل کر گھائی میں گر گئے۔ شاہ اسادا کی آخری وصیت کے مطابق اور عوام کے پُرزور مطالبے پر شہزادہ ساجھانا اور ملکہ مادام زبوری کی تاجپوشی کی رسم سات دن کے سوگ کے بعد ادا کی جائے۔

-☆-

ایلینز

یہ ایک انوکھے سفر کی کہانی ہے۔

آپ نے عجیب و غریب سفروں کی کہانیاں سنی ہیں۔ سندباد کے سفر، الف لیلوی سفر، گلیور کے سفر، بالشتیوں میں، دیوقامتوں میں۔

لیکن صائم کی ماں کا یہ سفر بالکل انوکھا تھا۔ وہ کبھی عازمِ سفر نہ ہوئی تھی۔ نہ ہی رختِ سفر باندھا تھا۔ نہ ہاتھ میں لگام تھامی تھی نہ پاؤں رکاب پر رکھا تھا۔

نہ وہ کبھی جہاز پر سوار ہوئی تھی نہ جہاز طوفان سے ٹکرایا تھا نہ وہ بہہ کر کسی انجانے جزیرے کے ساحل پر جا لگی تھی۔ پھر پتہ نہیں کیسے۔۔۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ ایک ان جانی بے گانی مخلوق اس کے گرد بھیڑ لگائے کھڑی اسے یوں دیکھ رہی ہے جیسے وہ عجوبہ مخلوق ہو۔

یہ سفر اس لحاظ سے انوکھا تھا کہ اماں نے خود حرکت نہ کی تھی۔ بلکہ ایک ایلین ماحول خود بخود چل کر اس کے اردگرد آ کھڑا ہوا تھا۔

وہ سوچنے لگی۔۔۔ یا اللہ یہ میں کہاں آ گئی ہوں۔ یہ کون لوگ ہیں۔ یہ لوگ مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں۔

ان ایلینز میں بہت سے چہرے مانوس سے دِکھتے تھے لگتا تھا جیسے وہ انہیں جانتی ہو جیسے وہ اس کے ہم سفر رہے تھے۔ لیکن پتہ نہیں کیوں ایک نظر میں وہ مانوس دکھتے دوسری نظر میں ایسے لگتا جیسے بیگانہ ہوں۔ ایلینز

پھر اماں کو اپنے پر شک پڑنے لگا۔۔۔ میں کون ہوں۔۔۔ کہاں ہوں۔۔۔ میرا

مصرف کیا ہے۔۔۔کس لیے ہوں۔۔۔کیوں ہوں۔۔۔

اسے کچھ سمجھ میں نہ آیا۔۔۔وہ سوچتی رہی، محسوس کرتی رہی، سوچتی رہی، حتیٰ کہ وہ بیمار پڑ گئی۔ڈاکٹر نے ٹوٹیاں لگا کر اسے دیکھا۔

ڈاکٹر تو صرف ڈائی گنوسز کرتے ہیں انہیں بیماری سے دلچسپی ہے۔انسان سے نہیں انہیں ابھی تک شعور نہیں ہوا کہ بیماری روح سے پھوٹتی ہے۔ڈاکٹر بھلا کیا کہتا، بولا مریضہ کو کوئی بیماری نہیں، صرف کمزوری ہے بڑھاپا ہے۔

جس کا فکر جسم تک محدود ہو وہ کیسے سمجھے گا کہ بڑھاپا عمر سے نہیں ہوتا بلکہ جینے کی اُمنگ نہ رہے تو اعضا بوڑھے ہو جاتے ہیں۔

اماں میں جینے کی اُمنگ نہ رہی تھی۔

جینے کی اُمنگ تبھی قائم و دائم رہتی ہے جب کوئی خواہش، کوئی خیال، کوئی اُمید، کوئی فرد کوئی مطمحِ نظر، کوئی سراب آپ کو انگلی پکڑ کر چلائے۔جینے کی اُمنگ تبھی قائم رہتی ہے جب آپ کی اپنی حیثیت ہو۔اہمیت ہو۔آپ کو احساس ہو کہ آپ کا کوئی مصرف ہے۔

کئی ایک سال سے اماں محسوس کر رہی تھی کہ اس کا کوئی مصرف نہیں رہا۔وہ ایک فالتو ہستی ہے۔

رضائی میں پڑی ہوئی سلوٹ میں جنبش ہوئی۔ہڈیوں کے ایک ڈھانچے نے سر نکالا۔بے نور آنکھوں نے صائم کی طرف دیکھا۔نگاہیں صائم سے پار ہو گئیں۔اگر اماں کے لیے صائم میں کوئی مفہوم ہوتا تو یقیناً نگاہ صائم پر رک جاتی۔۔آنکھوں میں لگاؤ کی چمک لہراتی لیکن صائم تو عرصہ دراز سے اس کے لیے ایلین بن چکا تھا۔

صائم آسیہ کا اکلوتا بیٹا تھا جو اس وقت ماں کی چارپائی کی پائنتی پر بیٹھا ہوا تھا اس وقت کمرے میں ماں اور بیٹے کے سوا کوئی نہ تھا۔

آٹھ دن سے وہ اس کی پائنتی پر بیٹھا تھا۔آٹھ دن سے آسیہ مر رہی تھی۔

دفعتاً اس ہڈیوں کے ڈھانچے میں تڑپ پیدا ہوئی۔آسیہ کی مضطرب لیکن کراری آواز گونجی اب کیا دیر ہے۔اب کس کا انتظار ہے۔تم مجھے لے جاتے کیوں نہیں۔اس نے

اردگرد کی فضا کو مخاطب کر کے کہا۔ آسیہ کے بات کرنے کے انداز سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کمرے میں صائم کے علاوہ اور لوگ بھی موجود تھے۔ شاید روح ہوں، ہیولے ہوں، فرشتے ہوں۔

آٹھ دن سے وہ آسیہ کے اردگرد منڈلا رہے تھے۔ آٹھ دن سے وہ انہیں ڈانٹ رہی تھی میرا منہ کیا تک رہے ہو۔ مجھے لے جاتے کیوں نہیں۔ اب کیا دیر ہے۔

اس نے گھر کے باقی لوگوں سے بات کرنی چھوڑ رکھی تھی۔

گھر میں صرف چند ایک لوگ ہی تو تھے۔ صائم اس کی دو نوجوان بیٹیاں سلمیٰ، ستارہ ایک بیٹا سمیع، بہو اسما اور صائم کی بیوی ثمینہ۔

عرصہ دراز سے آسیہ ان سب افراد کی زندگیوں سے خارج ہو چکی تھی۔

اگرچہ ان سب کے دلوں میں بوڑھی اماں کی بڑی عزت تھی۔ لیکن عزت تو کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ عزت تو کوئی جذبہ نہیں عزت تو تہذیب کی ایک مصنوع ہے۔ جس طرح پلاسٹک کے پھول ہوتے ہیں۔ اماں وہ شہد کی مکھی تھی جس کے اردگرد پلاسٹک کے پھولوں کا باغ سجا ہوا تھا۔

صرف ایک گھرانے کو اماں سے قلبی تعلق تھا۔ وہ ڈاکٹر صولت کا گھر تھا۔ ڈاکٹر صولت اماں کے بھائی کا بیٹا تھا اس کا گھر ایک جزیرہ تھا جہاں جدید کی آندھی اثر انداز نہ ہوئی تھی جہاں ماضی ابھی تک حال کا بہروپ دھارے آلتی پالتی مار کر بیٹھا تھا۔

ڈاکٹر صولت کا گھر واحد گھر تھا جہاں اماں کے لیے ایلینز نہیں بستے تھے۔ جہاں وقت کو دوام مل گیا تھا جہاں ابھی تک انیسویں صدی چل رہی تھی۔ جہاں بڑی اماں کو محسوس ہوتا کہ وہ اصلی پھولوں پر بیٹھی ہے۔

لیکن صائم کے لیے ڈاکٹر صولت کا گھر ایک دقیانوسی مقام تھا اسے صولت سے شکایت تھی کہ اس نے گھر کو حنوط کر رکھا ہے۔ اور اس حنوط شدہ گھر نے آسیہ کو اس قابل نہ چھوڑا تھا کہ کہیں اور رہ سکے صولت کی نسبت صائم کا تعلق آسیہ سے کہیں زیادہ پرانا اور گہرا تھا۔

آسیہ اور صائم نے سال ہا سال اکٹھے مل کر دکھ سہے تھے۔ اکٹھے مل کر دُکھ سہنا گہرا تعلق پیدا کر دیتا ہے۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب گرد و پیش ایلین نہ تھا۔ جب آسیہ اپنے دور میں زندگی بسر کر رہی تھی۔ جب لوگ اس کی بات سمجھتے تھے۔ اسے اہمیت دیتے تھے جب زندگی میں اس کا ایک مقام تھا، مفہوم تھا۔

ان کے دُکھوں کی وجہ صرف حالات کی ناسازگاری تھی۔ اس ناسازگاری کی بنیاد ایک عام سا حادثہ تھا کہ خاوند نے دوسری شادی کر لی تھی اور آسیہ کو ہمیشہ کے لیے گھر کی نوکرانی کی حیثیت دے دی گئی تھی۔

جس باورچی خانے میں اسے دن رات کام کرنا پڑتا تھا۔ وہاں سے اسے اپنے اور اپنے بیٹے کے لیے طعام نہیں ملتا تھا۔ اس لیے مالک اور مالکن کو کھانا کھلانے کے بعد اسے اپنا چولہا جھونکنا پڑتا تھا۔

مالک کے باورچی خانے کا ایک فائدہ ضرور تھا کہ جب وہاں بھنڈی پکتی تو آسیہ بھنڈیوں سے اُتاری ہوئی ٹوپیاں لے آتی اور ان سے اپنی ہانڈی پکاتی جب وہاں کریلے پکتے تو کریلوں سے چھیلا ہوا بور پکانے کو مل جاتا۔ نوکرانی کے بیٹے کے لیے بور، کریلے تھا۔ ٹوپیاں، بھنڈیاں تھیں۔ چھلکے، سبزیاں تھیں۔

مالک رات گئے گھر آتا تھا اور نوکرانی کو انہیں کھانا کھلانے سے پہلے چھٹی نہیں ملتی تھی۔ کھانا کھلا کر جب وہ آوٹ ہاؤس میں پہنچتی تو بیٹا سو چکا ہوتا۔ پھر وہ چولہا جھونکتی چھلکے پکاتی اور جب ہانڈی تیار ہو جاتی تو بیٹے کو جگاتی۔ اسے کھانا کھلاتی۔

بیٹا کھا تو لیتا تھا۔ مگر جاگتا نہ تھا۔ اس لیے اسے یاد نہیں تھا کہ بچپن میں اس نے کبھی رات کا کھانا کھایا ہو۔

پھر مالک کا سٹیٹس اونچا ہونے پر ایک ٹرینڈ باوردی نوکر رکھنا لازم ہو گیا۔ اس لیے آسیہ کو نکال دیا گیا۔ اور ماں بیٹا آزاد ہو گئے۔

آزادی نے انہیں نئے مسائل سے دوچار کر دیا الاؤنس بہت قلیل تھا ضروریات

بڑھتی ہی چلی جارہی تھیں۔

بڑھتی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ماں بیٹے کو محنت مزدوری کرنی پڑتی انہوں نے مل کر چارپائیاں بُنیں۔ کتابوں پر جلدیں باندھیں۔ کاغذ کے پھول بنائے پتنگ بنائے۔ دھاگا خرید کر اس پر مانجھا لگایا تاکہ ڈور بیچ سکیں۔ بچوں کے کھلونے بنائے آسیہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا محنت مزدوری کرے۔ اس کی خواہش تھی کہ ایک سلائی مشین خرید لے اور اکیلی سلائی کا کام کرے لیکن اتنے پیسے نہ تھے۔ پھر کسی مخیّر نے قرض کے طور پر ایک پرانی گھسی پٹی مشین خرید دی اور وہ کپڑے سینے لگی۔

آسیہ ہرفن مولا عورت تھی۔ وہ ہر کام کرسکتی تھی۔ وہ ہر عام سے عام کام میں بھی انفرادیت کی کلیاں ٹانک دیا کرتی تھی۔ انوکھے کام سوچا کرتی انوکھی چیزیں بنایا کرتی۔ لیکن یہ اس دور کی بات ہے جب ہاتھ کے کام کی قدر نہ تھی، قیمت نہ تھی۔

ان کا باہمی تعلق بہت گہرا تھا۔ اس تعلق کے کئی رخ تھے۔ ماں بیٹے کا تعلق۔ مظلومیت کا تعلق۔ غربت کا تعلق۔ مزدوری کا تعلق۔ دُکھ کا تعلق۔

اگر صائم علم حاصل نہ کرتا۔ اور وہ دونوں ہمیشہ کے لیے مزدور رہتے، محنت اور مشقت بھری زندگی بسر کرتے تو یہ تعلق جوں کا توں قائم رہتا۔ لیکن علم قینچی بن کر آیا اور اس نے اس عظیم تعلق کے پُرزے اُڑا دیے۔

شاید علم دوست اس پر احتجاج کریں اور اپنی جواز پسندی کے تحت تاویل پیش کریں کہ جو خلوص بھرے تعلق کے پُرزے اُڑا دے وہ علم دوست نہیں ہوسکتا۔ مجھے کسی حتمی علم کا پتہ نہیں میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ جو رائج الوقت ہو وہی علم ہوتا ہے۔ ہر دور میں رائج الوقت علم کا خصوصی رُخ ہوتا ہے۔

آسیہ کے دور میں ایمان لانا تھا۔۔۔ صائم کے دور میں شک کرنا۔۔۔ تاریخ شاہد ہے کہ علم کا رُخ ہمیشہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا رہا ہے صائم کے زمانے میں عقل وخرد کا دور تھا۔ جوں جوں وہ علم حاصل کرتا گیا جوں جوں عقل وخرد کی آنکھیں کھلتی گئیں توں توں جذبہ مضحکہ خیز ہوتا گیا۔ تعلقات کٹتے گئے۔

صائم کو آسیہ کے خلاف کئی ایک شکایات پیدا ہو گئیں۔ اماں ایسے مرد سے شادی کرنے پر کیوں رضامند ہوئی جو کسی ایک عورت کا ہو کر نہیں رہ سکتا تھا بلکہ جسے عورت ذات سے دلچسپی تھی۔ اماں نے اپنے ہی گھر میں نوکرانی بن کر رہنے کو کیوں منظور کیا۔ اماں نے ظلم کے خلاف آواز بلند کیوں نہ کی۔ اماں نے اندھی وفا شعاری کو کیوں اپنائے رکھا، شاید اماں غم خور ہو، شاید اماں ایذا پسند ہو۔

آہستہ آہستہ صائم کی نگاہ میں مظلوم اماں، تسکین پسند آسیہ نظر آنے لگی۔ دکھی اماں، ایذا پسندی کی لذت سے سرشار دکھائی دینے لگی۔ یوں باہمی مظلومیت کا تعلق ٹوٹتا گیا۔ دکھ کا تعلق ٹوٹتا گیا۔ مزدوری کا تعلق ٹوٹتا گیا۔ ایذا پسند کے لیے محنت جدوجہد نہیں ہوتی۔ دُکھ دُکھ نہیں ہوتا۔ بلکہ انا کی تسکین ہوتی ہے۔ بلغ کے لیے جوہڑ ہوتا ہے۔

اس عقل و دانش بھری سوچ بچار کی توجہ سے ایک ایسا دن آیا جب دونوں کے درمیان صرف ایک تعلق باقی رہ گیا۔ بیٹے اور ماں کا تعلق۔ لیکن بیٹے اور ماں کا تعلق تو ایک عارضی تعلق ہے جو صرف اس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک بیٹا، ماں کا محتاج ہوتا ہے، وہ تو ماں کا بیٹے سے تعلق ہے جو واحد دائمی تعلق ہے۔

چونکہ صائم ماں کا محتاج نہیں رہا تھا اس لیے وہ تعلق بھی ٹوٹ چکا تھا۔ صرف برائے نام باقی تھا اس برائے نام تعلق کو ہم رسمی طور پر احترام بھی کہتے ہیں۔

احتراماً صائم آٹھ روز سے اماں کی پائنتی پہ بیٹھا تھا۔ اور آٹھ روز سے اماں مسلسل مر رہی تھی۔

دیر تک وہ رضائی میں پڑی ہوئی سلوٹ کی طرف دیکھتا رہا۔ کوئی جنبش نہ ہوئی۔ دفعتاً اس کے ذہن میں ایک خیال اُبھرا شاید۔۔۔ اس نے پھر سے غور سے اماں کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہ میں ڈر نہیں بلکہ اُمید کی جھلک تھی۔ جیسے اس شاید نے آنکھوں میں دیا روشن کر دیا ہو۔

چونکہ اماں نے منہ رضائی میں ڈھانپ رکھا تھا۔ صائم نے بیٹھے بیٹھے اندازہ لگایا کہ ماں کا دل کہاں ہوگا۔ پھر وہ اس مقام کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا کہ حرکت ہے یا

نہیں۔

وہ مقام بالکل ساکت تھا۔

اس کے دل سے ایک ہلکی سی آواز آئی جیسے کسی نے اطمینان کا سانس لیا ہو پھر ایک سرگوشی سی اٹھی۔ اچھا ہوا بیچاری اس عذاب سے مخلصی پاگئی۔

اس کے اندر رچی بسی ہوئی عقل بول رہی تھی۔

پتہ نہیں کبھی کبھی وہ سرگوشیوں میں کیوں بولتی تھی۔ ایسے کیوں بولتی تھی جیسے وہ احساسِ گناہ سے بھیگی بھیگی ہو۔

اس کے اندر رچی بسی عقل تو گھر کی ملکہ تھی۔ عرصہ دراز سے گھر پر اس کا راج تھا پھر وہ سرگوشیوں میں بات کیوں کرتی تھی۔ کسی سے ڈرتی تھی۔ صائم کے دل میں وہ کون تھا جس کے ڈر سے سہم جاتی۔ شرمسار ہو جاتی۔ ندامت سے بھیگ جاتی اس کی آواز زیر لبی ہو کر رہ جاتی۔

صائم کو تو اپنی عقل پر ناز تھا۔ وہ اپنے آپ کو دانشور سمجھتا تھا۔ محفلوں میں جان بوجھ کر بلند آواز میں ایسے ادراکی نکتے بیان کرنے کا عادی تھا جو دوسروں کو چونکا دیں۔

محفلوں کی بات چھوڑیئے۔ اس نے کئی بار اپنی عقل و دانش کے بل بوتے پر ماں سے کہہ دیا تھا اماں جب تم مرو گی تو میں دیگیں چڑھا دوں گا۔ غریبوں کو کھانا بانٹوں گا۔ شکرانے کے نفل پڑھوں گا یا اللہ تیرا بڑا احسان ہے کہ تو نے میری ماں کو اتنی لمبی عمر دی اور مجھے ماں کے ساتھ اتنی دیر اکٹھے رہنے کو موقعہ عطا کیا۔ اور ماں میں گھر والوں سے کہہ دوں گا کہ میری ماں کے مرنے پر کوئی نہ روئے۔ کوئی بین نہ کرے۔ رونا اور بین کرنا تو ناشکری کے مترادف ہے۔

آسیہ کی عمر ۹۵ سال کی تھی۔ صائم سمجھتا تھا کہ ساٹھ ستر سال کے بعد موت زحمت بن جاتی ہے۔

صائم خود ستر سال کا ہو چکا تھا خود اس کے اپنے اردگرد ایلین ماحول قائم ہو چکا تھا اس کی اپنی بیٹیاں سلمٰی اور ستارہ اس کے خیالات اور احساسات سے بیگانہ تھیں بالکل ایسے ہی

جیسے وہ خود ماضی میں اماں سے بیگانہ ہوا تھا۔

اماں کے ایلین بننے کی بات تو سمجھ میں آتی تھی۔ اماں جدید تعلیم سے آراستہ نہیں تھی۔ لیکن سلمٰی، ستارہ کے ایلین بننے کی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ صائم کا ماں سے تعلق تو علم نے کاٹا تھا۔ لیکن اولاد سے کٹنے کی ذمہ داری کس پر تھی۔

اس ڈر کے مارے کہ اس کے اپنے بچے اس سے کٹ نہ جائیں وہ مسلسل علم حاصل کرتا رہا تھا۔ رائج الوقت علم زمانے کے ساتھ ساتھ چلتا رہا تھا تاکہ پیچھے نہ رہ جائے۔۔۔ پھر بھی وہ پیچھے رہ گیا تھا۔ کیوں؟

اس مسئلہ پر وہ سوچتا رہا تھا ایک بات تو یقینی تھی کہ وہ بے علمی کی وجہ سے پیچھے نہیں رہا تھا۔ دانش کی وجہ سے پیچھے نہیں رہا تھا۔ نئے فکر سے ناواقفیت کی وجہ سے پیچھے نہیں رہا تھا۔ صائم نے کبھی نہ سوچا تھا کہ شاید وہ علم ہی کی وجہ سے پیچھے رہ گیا ہو۔ شاید نئی نسل علم و دانش چھوڑ کر پھر سے جذبے کی طرف چل پڑی تھی۔ یہ سوچے بغیر کہ جذبہ تو راستہ ہوتا ہے منزل نہیں منزل کیسی۔۔۔ ان کے جذبے کا تو کوئی رُخ ہی نہ تھا۔ صرف شدت ہی شدت تھی، ہانڈی آگ پر چڑھی تھی مگر ہانڈی میں تھا کیا۔

سوچ سوچ کر وہ ہار گیا مگر سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔

مثلاً سلمٰی کو فلم اس لیے پسند آتی کہ اس میں کوئی خاص اداکار ہوتا۔ اگر وہ اداکار ہوتا تو سب کچھ آپ ہی آپ ہو جاتا فلم کی کہانی عمدہ ہو جاتی۔ فوٹوگرافی شاندار ہو جاتی۔ مکالمے چُست ہو جاتے۔

ستارہ کو ٹی وی سیریز اس لیے ناپسند ہوتی کہ اس میں کام کرنے والی کسی ایکسٹرا عورت کی شکل وصورت ایسی ہوتی کہ دیکھ کر اسے گھن آتی۔

سلمٰی سمجھتی کہ کالج کی فلاں پروفیسر اس قدر عمدہ پڑھاتی ہے کہ ایک ایک لفظ دلنشین ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ وہ بڑی پیاری ہے کتنی پیاری ہے وہ۔ سلمٰی یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھی کہ کوئی بدشکل پروفیسر اچھا پڑھا سکتی ہے۔

ستارہ سمجھتی تھی کہ فلاں مضمون اس لیے اچھا ہے کہ فیشن ایبل سرکلز میں اس کا ذکر رہتا

ہے اور فلاں مضمون اس لیے برا ہے کہ اس میں دقیانوسی سوچیں بھری پڑی ہیں۔

اتفاقاً صائم نے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازے میں سلمٰی کھڑی تھی۔ بال لٹک رہے تھے۔ چہرہ اُترا ہوا تھا۔ سر دروازے کی چوکھٹ سے لگا ہوا تھا۔ ٹکٹکی باندھے وہ آسیہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

سلمٰی حزن وملال کی تصویر بنی کھڑی تھی۔

گھر کے سارے افراد حزن وملال سے بھر ہوئے تھے۔ سارا ماحول حزن وملال سے بوجھل ہو رہا تھا۔

اس لیے نہیں کہ ماں یا دادی اماں مر رہی تھی۔

بلکہ اس لیے کہ گھر میں موت گھس آئی تھی چاروں طرف موت منڈلا رہی تھی سارا گھر موت سے یوں لبالب بھرا ہوا تھا جیسے انار، دانوں سے بھرا ہوتا ہے۔

ان جانے میں گھر کا ہر فرد آرزومند تھا کہ وہ بوجھ اٹھ جائے۔ بوجھل بورڈم دور ہو جائے۔ گھر کا موڈ بحال ہو جائے۔ چاہے بوڑھی اماں پر کچھ بیت جائے۔

سلمٰی نے اشارے سے پوچھا کہ بڑی اماں کا کیا حال ہے۔

صائم نے مایوسی میں سر ہلا دیا۔

سلمٰی کی اداسی اور گہری ہو گئی۔ سر ڈھلک گیا بال لٹکنے لگے اور ساتھ ہی آنکھوں میں اُمید کی کرن ناچنے لگی۔

سلمٰی ایک جذباتی لڑکی تھی۔ اسے آسیہ سے بڑی محبت تھی لیکن کیا کرتی، اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے مجبور تھی۔ اس کی چہیتی سہیلی شافی کے بیاہ کو صرف آٹھ دن باقی رہ گئے تھے۔ اس نے شافی سے وعدہ کر رکھا تھا کہ اس کے بیاہ پر ملتان آئے گی۔

وہ چاہتی تھی کہ چاہے کچھ ہو جائے لیکن اس کے ملتان جانے میں رخنہ نہ پڑے اور اگر اماں یونہی پڑی رہی تو وہ ملتان نہ جا سکے گی۔

پہلے ہی اماں کی بیماری کی وجہ سے سلمٰی کی ساری روٹین تباہ ہو چکی تھی۔ مثلاً فون ہی لیجیے۔

فون اس برآمدے میں لگا ہوا تھا جو اماں کے کمرے سے ملحق تھا۔ اماں کی وجہ سے سلمیٰ فون کو آزادانہ طور پر استعمال نہیں کر سکتی تھی۔

پہلے تو عادی طور پر وہ ہر آنے والی کال کو بڑے شوق سے موصول کیا کرتی تھی۔ ان کالوں میں زیادہ تر رانگ نمبر ہوتے تھے وہ ان رانگ نمبروں کو بڑے نخرے سے جھاڑ پلا دیا کرتی۔ یا بڑے تہذیب یافتہ انداز سے مذاق اُڑا دیتی۔

خاص سہیلیوں کے علاوہ سلمیٰ کو کسی خاص رائٹ یا رانگ نمبر سے دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن رانگ نمبر کو کاٹنے میں کتنا مزا آتا تھا۔ واٹ فن۔۔۔ اظہارِ لگاؤ کے جواب میں اظہارِ بے نیازی میں کتنی لذت ہوتی ہے۔

اماں کی بیماری کی وجہ سے وہ سہیلیوں سے بھی بات نہیں کر سکتی تھی۔ پہلے تو وہ فون پر گھنٹوں باتیں کیا کرتی تھی۔ پتہ نہیں کیا باتیں کرتی تھی۔ پاس کھڑے شخص کے کچھ پلے نہیں پڑتا تھا۔

فون پر لمبے لمبے وقفوں کے بعد ایک ایک لفظ بولتی رہی۔ اچھا۔۔۔ کیوں۔۔۔ بور۔۔۔ موڈ نہیں وہ کیسے، ایسے الفاظ یا پھر خالی ہنس دیتی۔ چھوٹی ہنسی، لمبی ہنسی، مہذب ہنسی جس میں ہنسی نہ ہوتی البتہ آواز کے زیر و بم میں جاذبیت ضرور ہوتی۔

سلمیٰ کے لیے اماں کی صحت یا بیماری اہم نہ تھے۔ اہم بات تو یہ تھی کہ اس کی روزمرہ بحال ہو جائے۔

ستارہ کو بھی اماں سے بڑا لگاؤ تھا لیکن وہ بھی مجبور تھی۔

ستارہ نے اپنی تمام تر اہمیت کا انحصار ہر امتحان میں کلاس میں فرسٹ آنے پر رکھا ہوا تھا۔ اماں کی بیماری کی وجہ سے سارے گھر پر جو بوجھ پڑا ہوا تھا۔ وہ اس کی پڑھائی میں مخل ہو رہا تھا۔ اسے فکر لگ گیا تھا کہ کہیں رابعہ اس کی پوزیشن ہتھیا نہ لے۔

رابعہ وہ بدصورت بھدی لڑکی تھی جو رٹا لگا لگا کر ہر امتحان میں اس کے پیچھے پیچھے چڑیل کی طرح لگی ہوئی تھی اور ہر بار سیکنڈ آتی تھی کہیں وہ چڑیل میری جگہ نہ لے لے۔ ستارہ کو صرف یہی ایک فکر لگا رہتا تھا۔ ہے اللہ۔ اماں کی بیماری کیا مصیبت ہے۔ اس

مصیبت سے کب جان چھٹے گی اسے اس بات پر غصہ آتا تھا کہ اماں ڈاکٹر کا علاج کیوں نہیں کراتی۔

ستارہ کی بات سچی تھی۔ عرصہ دراز سے اماں نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ وہ علاج نہیں کرائے گی۔ اسے ڈاکٹروں پر اعتماد نہیں تھا۔

اب کیا حال ہے۔ صائم کی بیوی ثمینہ نے کمرے میں داخل ہو کر پوچھا۔

صائم نے مایوسی میں سر ہلا دیا۔

ثمینہ چارپائی پر بیٹھ گئی۔ وہ حزن و ملال سے نچڑ رہی تھی۔

ثمینہ اور آسیہ کے مابین خدا ترسی کے سوا کوئی تعلق نہ تھا۔ ثمینہ ایک مذہبی عورت تھی مذہب اس کے لیے صرف خوف خدا تھا۔ وہ بیچاری خود اس گھر میں اکیلی تھی۔ وہ خود ایلینز میں گھری ہوئی تھی۔ وہ کر ہی کیا سکتی تھی۔

اگرچہ آسیہ اور ثمینہ کے مابین ساس بہو کا رشتہ تھا لیکن وہ رشتہ ہمیشہ برائے نام رہا تھا۔ سارا قصور آسیہ کا تھا۔ اگر وہ حکم چلانا جانتی تو ساس کا مرتبہ حاصل کر لیتی۔ لیکن وہ تو ازل سے حکم بجالانا جانتی تھی۔ چوکی پر بیٹھ کر حکم چلانا اس کے بس کا روگ نہ تھا۔ اس لیے بیٹے کے گھر میں اس کی کوئی حیثیت قائم نہ ہو سکی تھی۔ کیسے ہوتی خود بیٹے نے اسے قائم نہ ہونے دیا تھا۔ جب بھی اماں دل کی بات کرتی تو صائم عقل و دانش کی قینچی سے اسے کاٹ دیتا، اماں تم نہیں سمجھتی۔۔۔

بیٹے کے گھر سے ماں کا صرف ایک تعلق تھا۔

آسیہ میں خدمت اور کام کا جذبہ اس قدر گھر کر چکا تھا کہ جس گھر میں بھی وہ جا کر ٹھہرتی اس گھر کے چھوٹے چھوٹے کام شروع کر دیتی۔ ٹوٹی ہوئی چیزیں جوڑ دیتی۔ صوفوں کے کپڑے دھو کر پھر سے چڑھا دیتی۔ پردے رنگ کر نئے بنا دیتی۔ ٹوٹے ہوئے سوٹ کیس مرمت کر دیتی۔ پرانے کپڑوں کو جوڑ کر ٹی کوزیاں بناتی، رضائی کے ابرے تیار کرتی۔ میز پوش تکیے کے غلاف اور کیا کیا۔

آسیہ کی اس عادت کی وجہ سے لوگ اس کی قدر کرتے تھے۔

بیٹے کے گھر سے ماں کا بس یہی ایک تعلق تھا اسی واسطے ثمینہ اسے عزیز رکھتی تھی۔

کسی نے کبھی نہ سوچا تھا کہ یہ تعلق تو نہیں یہ تو مفاد ہے۔ بہر طور ثمینہ کا حزن وملال دلی تھا۔ کیونکہ وہ خداترس عورت تھی۔

کیوں ابا۔ سمیع نے داخل ہو کر پوچھا کیا حال ہے اماں کا۔

ویسا ہی ہے صائم نے کہا۔

اوہ۔ سمیع خاموش ہو گیا!

کچھ دیر کمرے پر خاموشی طاری رہی۔

اماں کو ضرور دوا کھانی چاہیے۔ سمیع بولا۔

ہاں۔۔۔ صائم نے کہا۔ لیکن اماں مانے بھی۔

ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم اماں کے لیے کچھ نہیں کر رہے سمیع نے کہا۔

ہاں۔

ایک فیلنگ آف گلٹ ہے۔ سمیع گویا اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔

سمیع ازلی طور پر مشنری کارکن تھا، اس کے لیے دفتر، دفتر نہ تھا بلکہ مقصدِ حیات تھا۔ کام اس کی زندگی کا مرکز تھا اور یہ مرکز پھیل کر سارے دائرے پر محیط ہو چکا تھا۔ باقی تمام رشتے اور تعلق لگاؤ سمٹ سمٹا کر دائرے کی لکیر پر یوں کھڑے تھے جیسے اوور لوڈڈ بس میں مسافر پائیدان پر لٹکے ہوتے ہیں۔

اوہ سمیع چونکا مجھے تو جانا ہے دفتر میں فنکشن شروع ہو چکا ہوگا۔ ابو میں واپسی پر ڈاکٹر لے آؤں اس نے یوں کہا جیسے صرف ڈاکٹر لے آنے سے اماں سے تعلق استوار ہو جائے گا۔ سنس آف گلٹ دور ہو جائے گا۔

اماں سے پوچھ لو۔ صائم نے کہا۔

اماں۔ اماں جی سمیع نے آواز دی۔

اماں نے کوئی جواب نہ دیا۔

پھر سمیع گھوم کر اماں کے سرہانے کی طرف جا کھڑا ہوا۔ اس نے اماں کے منہ سے

رضائی اُتار دی۔

اوہ۔۔۔وہ زیرلب چلّایا۔اماں تو۔۔۔اماں تو۔۔۔

کیا کہا۔کئی ایک چیخیں گونجیں۔

ماں گزر گئیں کیا۔

ہائے اللہ۔۔۔اماں چلی گئیں۔

پڑوس والے کہتے ہیں کہ صائم کے گھر سے چیخوں کی آوازیں بلند ہوئیں۔

کچھ لوگ کہتے ہیں نہیں چیخیں نہیں وہ تو بگڑے ہوئے قہقہوں کی آوازیں تھیں۔

میں نے وہ آوازیں نہیں سنیں۔لیکن میں محسوس کرتا ہوں جیسے صائم کی ماں مری نہیں بلکہ صائم کے گھر سے منتقل ہوکر میری ماں بن کر میرے گھر آ بیٹھی ہے۔جیسے یہ کہانی صائم کی ماں کی نہیں بلکہ میری ماں کی ہے،شاید تمہاری ماں کی ہو۔ہم سب کی ماؤں کی ہو، مجھے ایسے لگتا ہے جیسے وہ گھر گھر بیٹھی ہے اور اس کے اردگرد ایلینز یوں ناچ رہے ہیں جیسے وحشی قربانی کرنے سے پہلے بلی کے اردگرد ناچتے ہیں۔

☆

پرانی شراب، نئی بوتل

ہائی کی آواز سُن کر نمی نے آنکھیں کھول دیں۔ سامنے ہاتھ میں سٹیتھوسکوپ لٹکائے اس کی سہیلی صفو کھڑی تھی۔

''ہائیں اس وقت بستر میں۔'' صفو نے پوچھا۔

جسٹ لیزنگ۔ ان بیڈ

میں تو تجھے لینے آئی ہوں۔

کہاں۔

پکچر پر۔

کیوں۔

بڑی چارمنگ پکچر لگی ہے۔ بڑی مشکل سے چھٹی ملی ہے مجھے۔

مشکل سے کیوں۔

بھئی فائنل ایئر ہے۔ چھٹی کیسے دیں۔ چلو اُٹھو۔

اُوں ہُوں۔۔۔ موڈ نہیں۔

آج آخری دن ہے۔ پکچر اتر جائے گی۔

اُتر جائے۔

پتہ ہے لی میجر ہے اس میں۔

اُوں ہُوں آج لی میجر بھی اِن نہیں۔

کون اِن ہے آج۔ صفو مسکرائی۔

آج توصرف نمی اِن ہے۔

ویسے لگتی تو آؤٹ ہو۔ناکڈ آؤٹ۔

نانسنس۔نمی نے صفو کا ہاتھ پکڑ کر اسے بستر پر کھینچ لیا۔بیٹھو باتیں کرتے ہیں۔ایوننگ شو دیکھیں گے آنسٹ۔

گھر والے کہاں ہیں۔صفو نے پوچھا۔

وہ شہزادی آئی تھی۔پتہ نہیں کہاں لے گئی ہے۔

کون شہزادی۔

تم نہیں جانتی اسے کیا۔

اُوں ہُوں۔

سبھی جانتے ہیں اسے۔بڑی لاؤڈ وومن ہے۔اتنی بھڑکیلی ہے کہ دیکھ کر جھرجھری آتی ہے۔ست رنگا لباس پہنتی ہے۔جھلمل ٹائپ۔

وہی تو نہیں جو گیٹ ٹوگیدر سنیک بار پر ملی تھی ہمیں۔جب تو، میں اور انور وہاں بیف برگر کھا رہے تھے۔یاد نہیں انور نے اسے دیکھ کر کہا تھا۔یہ تو نری لپس ہی لپس اور ہپس ہی ہپس ہے۔

ہاں وہی۔نمی چلائی۔وہی تو ہے۔

تمہارے گھر کیسے آ پہنچی۔

ڈیڈی ایک روز اُنگلی لگا کر لے آئے تھے۔پھر خود آنے لگی۔

اچھا تو ڈیڈی نے انگلی لگا رکھی ہے۔

اُوں ہُوں۔اب تو وہ ڈیڈی کو اُنگلی لگائے پھرتی ہے۔

تیرے ڈیڈی بھی سمجھ میں نہیں آتے صفو مسکرائی۔

خوامخواہ بالکل ٹرانسپیرنٹ ہیں۔اندر جھانکے بغیر دیکھ لو۔

ان کا ایک نہ ایک افیئر تو چلتا ہی رہتا ہے۔

اُوں ہُوں۔افیئر نہیں۔انہیں صرف اس بات کا شوق ہے کہ کوئی انگلی لگائے

پھرے۔صرف اتنا۔

آگے کچھ نہیں۔

چاہے کوئی لگا لے۔

کوئی ہو یک رنگی ہو ست رنگی ہو بد رنگی ہو۔ ڈیڈی بڑے سینٹی مینٹل ہیں۔ جذبے میں لت پت رہتے ہیں۔بس ذرا چھیڑو۔فوارہ کھل گیا۔

تمہاری ممی بھی ساتھ گئی ہیں کیا۔

ہاں۔وہ ہمیشہ ساتھ جاتی ہیں۔ سپرویژن کے لیے۔

کیا مطلب۔صفو نے پوچھا۔

ممی اس ڈر کے مارے ساتھ چل پڑتی ہیں کہ کچھ ہو نہ جائے۔

صفو نے قہقہہ مارا۔ جیسے روک ہی لیں گی۔

ہاں۔اپنی طرف سے تو پورا زور لگاتی ہیں۔پُر ممی۔

مطلب یہ کہ بات نہیں بنتی۔

بات کیسے بنے۔ ڈیڈی تازہ کے قائل ہیں سیٹل کے نہیں اور ممی کو باسی ہو جانے میں کمال حاصل ہے۔ دراصل ممی کو ڈیڈی سے عشق ہے۔اپنا سب کچھ ان کے چرنوں میں ڈال رکھا ہے۔سب کچھ چرنوں میں ڈال دو تو دوسرا بے نیاز ہو جاتا ہے۔ پھر آہیں بھرو۔ انتظار کرو۔

آئی ہیٹ سچ ساب سٹف۔یہ بات تو پرانے زمانے میں چلتی تھی۔اب نہیں چلتی۔

اور جو انور سے بات چل رہی تھی تمہاری وہ۔

آئی لائیکڈ انور۔آل رائٹ۔ بہت اچھا کمپینین تھا۔ بڑا اگری ایبل۔

لکس بھی تو تھے۔

لکس کی کون پروا کرتا ہے آج کل۔ دے ڈونٹ میٹر۔ پرانے زمانے میں لوگ پری چہرہ ڈھونڈا کرتے تھے۔سوہنی پر جان دیتے تھے۔ یوسف کی طرف دیکھ کر انگلیاں چیر لیتے تھے۔اب وہ باتیں گئیں۔

عظمیٰ تو کہتی تھی نمی از سٹرکن ودلو فار انور۔

گڈ لارڈ۔ ناٹ ممی۔ بھئی مجھ سے یہ نہیں ہوتا کہ اپنے جذبات کی بھٹی کو ہوا دوں۔ دیتی رہوں۔ دیتی رہوں اور جب بھانبڑ مچ جائے تو بیٹھ کر رووں۔ نونو۔ آئی ایم ناٹ دی سابنگ اینڈ سائنگ ٹائپ۔ میں ہر حد توڑ سکتی ہوں صفو۔ دور جا سکتی ہوں لیکن اتنی دور نہیں کہ واپسی ناممکن ہو جائے۔ لو تو لینڈ آف نو ریٹرن میں لے جاتی ہے۔ ہیو گڈ ٹائم۔۔۔ بٹ لو۔۔۔ نونو۔۔۔ نیور۔

بھئی اس لحاظ سے میں تو ماڈرن نہیں صفو نے کہا۔ پھر وہ نمی کے قریب تر ہو گئی۔ کچھ پتہ ہے وہ آنکھیں مٹکا کر بولی تیرے پڑوس میں ڈاکٹر نجمی کے ہاں کون آیا ہوا ہے۔

کون ہے؟

لگتا ہے جیسے گلیکسو بے بی ہو۔ گہرے بھورے بالوں کا اتنا بڑا تاج گول چہرہ۔ نکھرا رنگ اور آنکھوں میں لال ڈورے۔ صفو نے یوں سینہ تھام کر کہا جیسے اندر ہلچل مچی ہو۔

امجی کی بات کر رہی ہو صفو نے پوچھا۔

تُو اسے جانتی ہے۔

ہاں دو ایک مہینے ہو گئے اسے آئے ہوئے۔

ملنے ملانے کے لیے آیا ہے کیا۔

اُوں ہُوں پوسٹنگ ہوئی ہے۔ الاٹ منٹ کے انتظار میں بیٹھا ہے اِدھر۔

کوئی ریلیٹو ہے ڈاکٹر نجمی کا۔

نیفیو قسم کی چیز ہے۔

کیسا لگا تمہیں۔ صفو نے پھر سینہ سنبھالا۔

اچھا خاصہ ہے۔ نمی نے بے پروائی سے کہا۔

اب بنو نہیں۔ نمی۔

میں تو نہیں بنتی۔ وہ بنتا ہے پتہ نہیں خود کو کیا سمجھتا ہے۔

ہے نمی۔ صفو نے پھر سینہ سنبھالا۔ پنک چک شرٹ۔ اورنج سٹرائپڈ کوٹ اور شاکنگ

۔۔۔گرین ٹائی۔ میں تو دیکھ کر بھونچکی رہ گئی۔ سٹنڈ۔

ہاں چارمنگ تو ہے نمی نے کہا۔

سلی۔ چارمنگ از نو ورڈ فار اٹ۔ کبھی ملی ہو اس سے۔

روز آجاتا ہے۔ ممی نے سر چڑھا رکھا ہے۔

اور تم نے۔۔۔

اُوں ہُوں۔۔۔

تُم سے بھی ملتا ہے کیا۔

ہاں۔

پھر۔۔۔ صفو کا تنفس تیز ہو گیا۔

پھر۔۔۔ نمی آنکھیں بند کر کے پڑ گئی۔

اسی پھر۔۔۔ کی وجہ سے نمی اس روز بستر پر پڑی تھی، لیز کر رہی تھی۔ لیز تو خیر بہانہ تھا لیز تو اس وقت ہوتا ہے جب امن ہو۔ اندر جھگڑے کی ہنڈیا پک رہی ہو تو امن کیسا۔ اور امن نہ ہو تو لیز کیسا۔ مانا کہ جھگڑا دل کی اتھاہ گہرائیوں میں تھا جہاں کے شور وغوغا کی آواز ذہن تک نہیں پہنچتی۔ مشکل یہ ہے کہ ذہن تک آواز نہ پہنچے تو بات اور الجھ جاتی ہے۔ خود کو تسلیاں دینا بھی ممکن نہیں رہتا۔ بہرحال سارا جھگڑا اس پھر۔۔۔ کا تھا۔

نمی کا دل پوچھ رہا تھا۔ پھر۔

اس کی نحیف آواز سن کر ذہن کہہ رہا تھا پھر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب سرے سے کوئی بات ہی نہیں تو پھر کیسا۔

نمی ایک ماڈرن لڑکی تھی۔ ماڈرن گھر میں پرورش پائی تھی ماڈرن ماحول میں جوان ہوئی تھی۔ اسے اپنے ماڈرن ازم سے عشق تھا عشق۔ چاہے کچھ ہو جائے ماڈرن ازم ہاتھ سے نہ جائے۔ اس کا دل پھر۔۔۔ پھر۔۔۔ کر رہا تھا۔ کراہ رہا تھا۔ سسکیاں بھر رہا تھا۔ اس وقت نمی کی زندگی کی ایک واحد پرابلم تھی کہ دل کی آواز نہ سنے۔ سنائی دے تو ان سُنی کر دے۔ اس کا صرف ایک حل تھا کہ ذہن سے چمٹ جائے اور قریب اور قریب جس طرح

جونک خُون کی رگ سے چمٹ جاتی ہے۔

نمی میں ذہن اور دل کی کش مکش پہلے کبھی اس شدت سے نہیں اُبھری تھی۔ نمی نے زندگی میں چند ایک افیئر چلائے تھے۔

سب سے پہلے سعید تھا۔ ان دنوں وہ بی اے میں پڑھتی تھی۔ وہ ایک دُبلا پتلا معنک لڑکا تھا۔ جب بھی کالج میں نمی اس کے سامنے آتی تو اس کی آنکھیں پھٹ جاتیں منہ کھلے کا کھلا رہ جاتا اور وہ گویا پتھر کا بن جاتا۔ پھر حواس گم قیاس گم بٹر بٹر نمی کو دیکھتا رہتا۔ حتیٰ کہ سب کو پتہ چل جاتا کہ وہ دیکھ رہا ہے۔ لڑکے پھبتیاں کستے، مذاق اڑاتے لیکن اُسے خبر ہی نہ ہوتی۔

پہلے تو نمی کو سعید پر بڑا طیش آتا رہا کہ یہ کیا ڈرامہ لگا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ پھر اسے ترس آنے لگا۔ نن کم پوپ دیکھنے کا سلیقہ بھی نہیں آتا۔۔۔ بے شک دیکھے۔ کون منع کرتا ہے لیکن پہلے دیکھنے کا انداز تو سیکھے۔

دوسرا جی اے اولیس تھا۔ اُدھیڑ عمر۔ ڈیڈی کا ہم کار۔ اسے دیکھنے کا سلیقہ تھا۔ اتنا سلیقہ تھا کہ نظر بھر کر دیکھتا ہی نہ تھا۔ بات ہوئی نا۔ بھلا دیکھنا مقصود ہوتا ہے کیا۔ لورز بھی کتنے احمق ہوتے ہیں یوں بٹر بٹر دیکھنے لگتے ہیں جیسے دیکھنا مقصود ہو۔ یا شاید اتنا دیکھتے ہیں اتنا دیکھتے ہیں کہ بھول جاتے ہیں کہ مقصد کیا تھا۔ دیکھنا خود راستے کی رکاوٹ بن جاتا ہے۔ چلو مان لیا کہ دیکھنا تعارف کے لیے ضروری ہے لیکن انٹی میسی مقصود ہو تو۔۔۔

پھر وہ انور تھا۔ کتنا اچھا کمپینین تھا لیکن اکیلے میں کبوتر سی آنکھیں بنا کر بیٹھ جاتا۔ بھئی کوئی بات کرو جو چھیڑ دے۔ کوئی جوک جو گدگدا دے، ہنسا دے۔ کوئی منتر پھونکو کہ کلی کھل کر گلاب بن جائے۔ بھلا گھٹنے ٹیکنے سے کیا ہوتا ہے خوامخواہ کا سکینڈل۔ محبت میں یہی تو عیب ہے شور و غوغا مچا دیتی ہے۔ ڈھول اڑا دیتی ہے۔ راستے مسدود کر دیتی ہے۔ مواقع تباہ کر دیتی ہے۔

نمی کے افیئر ز تو بہت تھے۔ اب انہیں گنوانے کا فائدہ۔ بس تھے۔ دو ایک تو خاصی دور لے گئے تھے۔ ان تتلیوں نے نمی کو کلی سے پھول بنا دیا تھا۔ ایسا پھول جو بھنوروں کو بیٹھنے

نہیں دیتا لیکن اڑاتا بھی نہیں۔ تتلیوں کی اور بات تھی۔ وہ بھن بھن کر کے شور نہیں مچاتی تھیں۔ ڈھول نہیں اڑاتی تھیں۔ لیکن اس گلیکسو بے بی امجی نے آ کر مشکل پیدا کر دی تھی۔

پہلے دن تو باؤنڈری وال سے ہیلو ہیلو ہو گیا۔ امجی نے اپنا تعارف کرا دیا۔ دوسرے دن وہ بڑی بے تکلفی سے گھر آ گیا اور نمی کے چھوٹے بھائی عمران سے چڑی کھیلنے لگا۔ ممی آ گئیں تو ان سے گپیں ہانکنے لگا۔ ممی کو وہ لفٹ دی، وہ لفٹ دی کہ انہیں کبھی ملی نہ تھی وہ تو بوکھلا گئیں پھر نمی کے پاس آ بیٹھا۔ بات چھیڑ دی۔ باتیں تو خیر کلچرڈ تھیں لیکن نگاہیں بالکل ہی کروڈ چونکا دینے والی۔ چبھنے والی۔ بڑی ان یوژئل۔۔۔ بھلا پاس بیٹھ کر کبوتر سی آنکھیں بنانے کا مطلب ایڈیٹ۔

گلیڈ آئی تو خیر ہوا ہی کرتی ہے۔ وہ تو یوں ہے کہ دُور بیٹھ کر روٹین ٹاک کرتے کرتے ایک دم گلیڈ آئی کے زور پر جمپ لگایا اور گود میں آ بیٹھے ذرا سی گدگدی کی اور پھر واپس اپنی سیٹ پر دُور جا بیٹھے یہ تو جدید انداز ہے نا۔ اپنی توجہ جتائی۔ گڈ ٹائم کی خواہش کو آنکھوں میں سجایا اور پھر ایز یو ور ہو کر ایٹ اِز بیٹھ گئے۔ لیکن مسلسل آڑی ترچھی آنکھیں بنا کر بیٹھے رہنا۔۔۔ نان سنس۔

گلیڈ آئی تو گڈ ٹائم کی دعوت ہوتی ہے نا۔ اور آنکھیں بنا کر بیٹھے رہنا تو گویا اس بات کی رٹ لگائے رکھنا ہوا کہ دیکھ میں تیرے بنا کتنا دُکھی ہوں۔

وہ مثبت بات۔۔۔ اور یہ خالص نیگیٹو۔

ہاں تو امجی ویسے تو بڑا پیارا آدمی تھا۔ آدمی کہاں، آدمی نما لڑکا۔۔۔ اُٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا۔ بولنا سب کلچرڈ تھے بس اک ذرا آنکھیں بنانے کی بیماری لگی ہوئی تھی۔

سچی بات تو یہ ہے کہ نمی پہلے روز ہی امجی کو دیکھ کر بھونچکی رہ گئی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے اس کا آئیڈیل کپڑے پہن کر سامنے آ کھڑا ہوا ہو۔ وہ تو اچنبھے میں رہ گئی تھی۔ اب اس اچنبھے کا اظہار خود سے کیسے کرتی۔ جو دل کی آواز پر کان دھرتی تو محبت کی راہ پر گامزن ہو جاتی۔ اس کا انتظار کرتی۔ آہیں بھرتی۔ گھڑیاں گنتی۔ اولڈ فیشن غیر مہذب دقیانوسی باتیں۔

ایک پیاری سی سمارٹ سی خوب صورت لڑکی ماڈرن ازم کو چھوڑ کر دقیانوسی کیوں

بنے۔ اس لیے نمی سب کچھ پی گئی اور یوں تن کر بیٹھ گئی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

بہرطور امجی اپنا چکر چلا گیا تھا۔ اگر اس میں آنکھیں بنانے کی بیماری نہ ہوتی تو یقیناً افیئر چل جاتا۔ افیئر تو خیر اب بھی چل پڑا تھا لیکن وہ خالصتاً تفریحی نہ بن سکا۔ اور خالص تفریحی نہ ہو تو افیئر کیسا۔

اس کے بعد امجی نے ایک اور قیامت ڈھائی۔ فسٹ فلور پر اس کا کمرہ نمی کی کھڑکی کے عین سامنے کھلتا تھا کمبخت نے اپنی کرسی دروازے میں بچھالی اور نمی کی کھڑکی پر نگاہوں کی چاند ماری شروع کر دی۔

اس پر نمی اور بھی چڑ گئی۔ لو بھلا نگاہوں کی چاند ماری کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ان نیسس ری میرز اور کیا۔ بھئی جو ناک کو ہاتھ لگانا ہو تو سیدھا لگا لو ہاتھ کو سر کے پیچھے سے گھما کر لانے کی کیا ضرورت ہے۔

دو ایک مرتبہ اس نے کھڑکی سے جھانکا اور ان جانے میں جھینپ گئی اس پر اُسے غصہ آ گیا۔ بھلا جھینپنے کی کیا بات ہے اس میں۔ دیکھ ہی رہا ہے نا۔ احمق کو اتنا نہیں پتہ کہ یوں دیکھنے سے بات بنتی نہیں بگڑتی ہے۔۔۔ چلو دیکھتا ہے تو پڑا دیکھے۔ وہ اطمینان سے سرہانے سے ٹیک لگا کر کتاب پڑھنے لگی۔ لیکن ہر چند ساعت کے بعد کتاب کے صفحے سے دو آنکھیں اُبھرتیں۔۔۔ دل پھُر۔۔۔ پھُر۔۔۔ کرنے لگتا اور وہ پھر سے جھینپ جاتی۔

پھر ایک روز امجی اسے فلم پر لے گیا۔

شاید وہ انکار کر دیتی لیکن نمی کا چھوٹا بھائی عمران ضد کرنے لگا ممی بھی ان کی طرفدار ہو گئیں۔ ہوا آ، کیا حرج ہے۔

فلم دیکھنے میں واقعی کوئی حرج نہ تھا۔ سارا فساد تو نگاہوں کا تھا نا۔ سینما ہال کے اندھیرے میں نگاہیں تو چلتی ہی نہیں۔ رہا قرب کا سوال تو قرب پر تو اُسے کوئی اعتراض نہ تھا۔

جب امجی نے اندھیرے میں اس کا ہاتھ پکڑا تو نمی ذرا نہ جھینپی۔ یہ تو نوُ رُئل بات تھی۔ بارہا وہ اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ فلم دیکھنے گئی تھی۔ وہ اس خوشبودار اندھیرے سے واقف

تھی۔ اور اندھیرا اور خوشبو دار ہو تو ہاتھ پکڑنا تو ہوتا ہی ہے۔ امجی نے پکڑا تو نمی نے حسبِ دستور بازو ڈھیلا کر دیا۔

جلد ہی اس نے محسوس کیا کہ امجی کا دباؤ یوژئل نہیں ہے یوژئل دباؤ تو موقع کی مناسبت پر عمل میں آتا ہے نا، فلم میں اظہارِ محبت ہو تو۔۔۔ گڈ ٹائم کا اشارہ ہو تو۔ لیکن یہ دباؤ تو مسلسل تھا۔ دباؤ ختم ہوتا تو امجی کی ہتھیلی نمی کے ہاتھ پر چلنے لگتی جیسے ہاتھ کے بند بند کا جائزہ لے رہی ہو۔ جیسے ہاتھ پر کوئی امریکہ دریافت کرنے میں لگا ہو۔

نمی کی ہتھیلی پر پسینہ آ گیا۔ ہاتھ کے اس لمس نے پتہ نہیں کیا کر دیا۔ اک اَن یوژئل رابطہ قائم ہو گیا۔۔۔ دل سے رابطہ۔۔۔ دل پھُر۔۔۔ پھُر کرنے لگا۔ یہ کیا مصیبت ہے اُس نے ہاتھ چھڑا لیا۔

جب بھی دل پھُر۔۔۔ پھُر۔۔۔ کرنے لگتا تو وہ ہاتھ چھڑا لیتی۔۔۔ لیکن کچھ دیر کے بعد ان جانے میں اس کا بازو پھر اُدھر ہو جاتا۔ ہاتھ کرسی کے بائیں ہتھے پر ٹک جاتا۔۔۔ اور پھر وہی دباؤ۔

بیچاری عجیب مشکل میں تھی۔ دباؤ ہوتا تو جی چاہتا کہ یوژئل ہو جائے۔ نہ ہوتا تو جی چاہتا کہ ہو۔

گھر میں وہ روز ہی ملتے تھے۔ وہ روز آ جاتا تھا۔ نہ آتا تو عمران پکڑ کے لے آتا۔ ممی آواز دے کر بلا لیتی۔ ممی کے لیے تو وہ گھر کا فرد بن چکا تھا۔ ممی پہلے روز ہی سمجھ گئی تھی کہ وہ نمی میں انٹرسٹڈ ہے نرا گڈ ٹائمر نہیں۔ وہ تو خوش تھی پڑھا لکھا لڑکا اور پھر چھوٹتے ہی افسر۔ کیریئر۔ رہت بہت بالکل جدید طرز کی۔ اور پھر انڈی پنڈنٹ۔ چچا کے گھر میں صرف الاٹ منٹ کے انتظار میں بیٹھا ہے۔ پتہ نہیں کس روز مل جائے۔ دُور چلا گیا تو شاید توجہ بٹ جائے، ہٹ جائے اس لیے وہ چاہتی تھی کہ جلد کچھ ہو جائے۔ آخر نمی کی شادی تو ہونی ہی تھی۔ ایم اے کر چکی تھی۔ رشتے تو آئے تھے لیکن وہ تو سبھی سوشل قسم کے تھے یہ تو جوڑ کا تھا۔

ڈیڈی بھی خوش تھا اس نے پہلے روز ہی بھانپ لیا تھا کہ لڑکا سیریس ہے۔ بیماری لگا بیٹھا ہے ان کی ساری ہمدردیاں امجی کے ساتھ تھیں۔ کیسے نہ ہوتیں وہ خود سیریس نس کی

بیماری میں مبتلا تھا۔ بہر طور وہ بے نیاز قسم کا آدمی تھا بات بن گئی تو او کے نہیں تو او کے۔ جی اویس تو ہے ہی۔ بڑا افسر ہے پیچھے مربعے ہیں۔ صرف یہی نا کہ ادھیڑ عمر کا ہے۔ بال جھڑ چکے ہیں لیکن نمی کو اپنانے کے لیے کتنا بے تاب ہے۔ حکومت کرے گی عیش کرے گی۔ بیاہ اسی لیے تو کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد امجی اور نمی کی بہت سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ہوٹلوں میں پارکوں میں سینما گھروں میں۔ انہوں نے شاپنگ کیں۔ ڈرائیونگ پر گئے۔ پکنک سپاٹ دیکھے۔ ان ملاقاتوں میں امجی نے طرح طرح کے حربے آزمائے کہ نمی اس سے اظہارِ محبت کرے۔ نمی اس ضد پر اڑی رہی کہ امجی کے سر سے عشق کا بھوت اُتر جائے۔ اور وہ سیدھا سیدھا بوائے فرینڈ بن جائے۔

جب وہ شاپنگ پر جاتے تو امجی کوئی نہ کوئی تحفہ نمی کے لیے خرید لیتا۔ ایک دن اس کی ممی نے کہا، نمی تو نے اُسے کوئی تحفہ نہیں دیا۔ یہ کیا بات ہوئی بھلا۔

نمی نے سوچا کوئی ایسا تحفہ دوں کہ جل کر راکھ ہو جائے۔

مطلب جلانا نہیں تھا بلکہ اشارتاً سمجھانا تھا کہ مرد بنو۔ آہیں بھرنا چھوڑو۔ آنکھیں بنانا بے کار ہے۔ بھکاری نہ بنو۔ چھین کر لینا سیکھو۔ اس نے سوچ سوچ کر ایک چارم خریدا۔ ایک روپہلا بریسلٹ جو کلائی پر چوڑی کی طرح پہنا جاتا ہے۔

امجی اس چارم کو دیکھ کر بہت خوش ہوا سمجھا شاید نمی کے دل میں اس کے لیے جذبہ پیدا ہو گیا ہے اسے قطعاً خیال نہ آیا کہ کیپ سیک کے پردے میں نمی اسے چوڑی پہنا رہی تھی۔ بہر حال اس نے بڑی خوشی سے وہ چوڑی پہن لی۔

اُسی شام وہ دونوں ڈرائیونگ کے لیے جا رہے تھے دفعتاً ایک ویران جگہ پر امجی نے گاڑی روک لی۔ نمی کا دل خوشی سے اُچھلا۔

اس سے پہلے ڈرائیونگ کے دوران کئی بار اسے خیال آیا تھا کہ امجی گاڑی روک لے گا۔ ویران جگہ گاڑی روکنے کی بات تو فیشن تھی۔ کریز تھا۔ یُوژُل تھا۔

اس یُوژُل سے وہ اچھی طرح واقف تھی۔۔۔ لیکن امجی نے کبھی گاڑی نہ روکی تھی۔

اس کی تو ساری توجہ نمی کے چہرے پر مرکوز رہتی یا وہ نمی کے ہاتھ کو تھامے رکھتا یوں جیسے بلور کا بنا ہو۔

اس روز گاڑی رکی تو نمی خوشی سے اچھل پڑی۔ پھر آنکھیں بند کر کے خواب دیکھنے لگی۔ گہرے بھورے بال اس کی طرف لپکے اس کے منہ سے ٹکرائے پھر سارے چہرے کو ڈھانپ لیا۔ بریسلٹ والا بازو اس کی کمر میں حمائل ہو گیا۔

اس نے اطمینان کا سانس لیا آج سب نارمل ہو جائے گا۔ کبوتر سی آنکھیں بنانے اور خالی خولی ہاتھ تھامنے کی بیماری ختم ہو جائے گی اور پھر وہی یوزئل، گولڈن یوزئل۔

دیر تک وہ آنکھیں بند کر کے پڑی رہی۔ لیکن کچھ بھی نہ ہوا اس نے آنکھیں کھول دیں ساتھ والی سیٹ پر امجی بیٹھا دیوانہ وار اس کا ہاتھ چوم رہا تھا۔۔۔ ایڈیٹ وہ ملائی کی برف کی کلفی کی طرح جم کر رہ گئی۔

آخر امجی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا بولا۔ نمی آج مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔

اچھا تو بات کرنے کے لیے گاڑی روکی ہے اُسے غصہ آ گیا۔ ان حالات میں منہ زبانی کی بات کی کیا ضرورت ہے۔ خوامخواہ باتوں کی جلیبیاں تلنا۔ سلی فول۔

نمی۔ امجی بولا۔ کیا تمہارے دل میں میرے لیے کوئی محبت نہیں۔

محبت محبت وہ چڑ کر بولی۔ ڈونٹ ٹاک لائیک این انکل امجی۔ بھئی ہم ریشنل دور میں رہتے ہیں۔ بی ریزن ایبل۔ ذرا سوچو۔ لَو کیا ہے ایک متھ۔ ویسے آئی لائیک یو آل رائٹ۔

ٹھیک ہے اُس نے جواب دیا۔ لیکن میں اپنے سوال کا ڈائریکٹ جواب مانگتا ہوں۔ ڈو یو لَو می۔

وہاٹ از لَو وہ بولی۔ ایک خود فریبی ایک خود پیدا کی ہوئی فرنزی۔ ہے نا۔ کیا تم لَو کے جھوٹے سنہرے جال سے آزاد نہیں ہو سکتے۔

نہیں وہ بولا۔ مجھے تم سے محبت ہے آئی لَو یو میڈ۔

اوہ۔ اِٹ اِز اے پِٹی۔ نمی کے منہ سے نکل گیا۔

دیر تک وہ خاموش رہے پھر امجی بولا۔ نمی میں ایک ایسا جیون ساتھی تلاش کرنا چاہتا ہوں جو مجھ سے محبت کرتا ہو۔

وہ ہنسی۔ پھر تم اولڈ سٹی کا رُخ کرو۔ یہاں کلچرڈ ماحول میں تمہیں کوئی سونی نہیں ملے گی۔

یہ ان کی آخری گفتگو تھی۔

اگلے روز نمی کو پتہ چلا کہ امجی شفٹ کر گیا ہے اسے گھر مل گیا ہے۔

یہ جان کر نمی کا دل ڈوب گیا۔

لیکن خود کو سنبھالا۔ اچھا ہو گیا ہے۔ سو واٹ، اٹز آل رائٹ۔

دل کو سمجھانے کے باوجود کئی ایک مہینے بار بار سوتے جاگتے ان جانے میں گھرے بھورے بال اُڑتے اس کے چہرے پر ڈھیر ہو جاتے۔ پھر بریسلٹ والا ہاتھ بڑھ کر اسے تھام لیتا۔ بار بار وہ خود کو جھنجھوڑتی۔۔۔ چلا گیا ہے تو کیا۔ سو ہاٹ اٹ از آل رائٹ۔

ایک سال بعد نمی کی کے۔جی اویس سے شادی ہو گئی۔ اور اسے سب کچھ مل گیا۔ سجا سجایا گھر، نوکر چاکر۔ ساز و سامان۔ کاریں۔ سب کچھ اس کا خاوند اویس بڑا کلچرڈ آدمی تھا۔ اور چونکہ اُدھیڑ عمر کا تھا۔ اس کی زندگی کا تمام تر مقصد نوجوان بیوی کو خوش رکھنا تھا۔ بلکہ سپائیل کرنا تھا۔

اویس میں بڑی خوبیاں تھیں صرف عمر ڈھیلی ہوئی تھی بال گر چکے تھے۔ ٹانٹ نکل آئی تھی بہر حال نمی خوش تھی، بہت خوش۔

شادی کے دو سال بعد ایک روز اویس بر سبیل تذکرہ کہنے لگا۔ ڈارلنگ وہ تیری ایک ڈاکٹر سہیلی تھی۔ کیا نام تھا اس کا۔

صفو کی بات کر رہے ہو۔

کہاں ہوتی ہے وہ آج کل۔

پہلے تو پنڈی میں اس کا کلینک تھا۔ اب پتہ نہیں دو سال سے نہیں ملی وہ۔۔۔

پنڈی میں کس جگہ کلینک تھا۔

شاید لال کرتی کے چوک میں۔ کیوں کوئی کام ہے صفو سے۔

نہیں تو۔ اویس بولا۔ ویسے ہی پوچھ رہا تھا۔

دس پندرہ روز کے بعد اچانک صفو آ گئی۔

ارے تو صفو۔ نمی خوشی سے چلائی۔

کیسی ہے تُو۔ صفو نے پوچھا۔

فسٹ ریٹ۔

آر یو ہیپی۔

ہیپی از نو ورڈ فار اٹ نمی آنکھیں چمکا کر بولی۔

اچھا صفو سوچ میں پڑ گئی۔

بات کیا ہے۔ نمی نے پوچھا۔ کیا اویس ملا تھا تجھے۔

ہاں! ملا تھا۔ صفو نے تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد کہا۔ تیرے فکر میں گھلا جا رہا ہے۔

وہ میرے فکر میں۔

ہاں ہی از ویری مچ کنسرنڈ۔۔۔ وریڈ

مذاق نہ کرو صفو۔

آئی ایم ڈیڈ سیریس۔ اویس کہتا ہے تمہیں ہیلوسی نیشن ہوتے ہیں۔

مجھے۔

ہاں۔

مثلاً۔

کہتا تھا جب اکیلے میں میرے ساتھ ہوتی ہے تو کہتی ہے ڈارلنگ تم بال کیوں نہیں سنبھالتے میرے منہ پر پڑتے ہیں اور صفو رُک گئی۔

نمی چُپ ہو گئی۔

اور جانو تم بریسلٹ تو اُتار لیا کرو۔

نسنس نمی چیخی۔ ایسی بے معنی باتیں میں کرتی ہوں کیا۔

بے معنی تو نہیں صفو بولی میں خود اپنے میاں سے یہی کہا کرتی ہوں۔

کیا

کہ بال سنبھال لیا کرو میرے منہ پر پڑتے ہیں اور

اور۔ اپنا بریسلٹ تو اُتار لیا کرو۔

مذاق نہ کرنمی چلائی۔

تمہیں پتہ نہیں کیا۔ صفو سنجیدگی سے بولی۔ میری شادی ہو چکی ہے۔ ابھی سے۔

-☆-

حلوائی کی دکان

کتنی عجیب بات ہے۔

زندگی بھر میری تمنا رہی کہ کوئی مجھ سے سیدھی بات کرے اور میں اسے سیدھا اور صاف جواب دوں۔ لیکن اب جب انور نے مجھ سے دوٹوک کھلی بات کی ہے۔ تو مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا جواب دوں۔ صبح سے سوچوں میں پڑی ہوں۔ سوچ سوچ کر ہار گئی۔ کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔

میری کیفیت اس پنچھی کی سی ہے جو سالہا سال رکھ رکھاؤ کے پنجرے میں آزادی کی تمنا میں تڑپتا رہے۔ لیکن جب پنجرے کا دروازہ کھل جائے تو خود میں اُڑان کی طاقت نہ پائے۔

دراصل انور کی سیدھی بات سن کر میرے ذہن کا فیوز اُڑ گیا ہے۔ کیسے نہ اڑتا۔ زندگی بھر کبھی سیدھی بات نہ سنی تھی۔ گھر والے ہمیشہ جلیبیاں تلتے رہے۔ جوانی راستہ تلاش کروکی بھول بھلیاں میں بیت گئی۔ ہر بات سن کر سوچتی پتہ نہیں بات کا دوسرا رُخ کیا ہے۔ ہر بات میرے لیے جادو کا پٹارہ ہوتی۔ پہلے خالی پٹارہ دکھا دیا جاتا پھر جب بات کھلتی تو اس میں سے پھُر رر سے کبوتر اُڑ کر باہر آ جاتا۔

خالی پٹاروں سے اتنے کبوتر اُڑ کر باہر نکلتے دیکھے۔ اتنے کبوتر کہ میں سمجھنے لگی جب تک اندر کبوتر نہ ہو پٹارہ خالی ہو ہی نہیں سکتا۔

مجھے پتہ ہے کہ انور کی بات میں کوئی چھل بل نہیں۔ پھر بھی میں کبوتر کی منتظر بیٹھی ہوں کتنی بدنصیبی ہے۔

میری کہانی بڑی عام سی ہے۔صرف میری ہی نہیں۔کھاتے پیتے گھرانے کی ہر جوان لڑکی کی ہے۔

میرا نام ثانیہ ہے میں کوئی خدوخالی لڑکی نہیں ہوں۔مطلب یہ کہ دہن چھوٹا ہے ٹھوڑی نکلتے ہی ختم ہو جاتی ہے۔آنکھیں کشتیاں نہیں۔بنٹوں کی طرح گول ہیں۔ناک چھوٹی ہونٹ لٹکا ہوا۔بیڑا اونچا اور رنگ سفید کیا گندمی بھی نہیں شدھ سانولا۔۔۔لیکن خدوخال حُسن کا دور گیا۔خدوخال کون دیکھتا ہے آج کل۔۔۔خداداد حسن کے دن ختم ہوئے۔اب تو خود پیدا کردہ حسن چلتا ہے۔انگ انگ میں شوخی ہو،حرکت میں تڑپ ہو جسم میں پارہ بھرا ہو۔بس مارلیا میدان۔۔۔اور اگر بات میں بے تکلفی بھی ہو،جھجک نہ ہو تو کیا بات ہے۔

جس گھر میں، مَیں نے پرورش پائی وہ صرف کھاتا پیتا ہی نہ تھا بلکہ کمفرٹس ہی کمفرٹس۔بس جھیل میں کنول اُگے ہوئے تھے۔سازوسامان کی کوئی حد نہ تھی۔کام کاج کی مصیبت سے چھٹی،نوکروں کی ایک ٹیم تھی۔بس ایک ہی بندش تھی۔رکھ رکھاؤ کی بندش وہ بھی اکیلے میں نہیں۔بھئی نو دولتیے جو تھے۔کوئی آ جاتا تو بندش ہی بندش۔یوں ہیلو کرو۔یوں بیٹھو۔یوں دیکھو۔یوں بات کرو۔مطلب یہ کہ خود کو پریزنٹ کرو۔چینی کی پلیٹ میں رکھ کر دوسرے کے سامنے پیش کرو۔

چینی کی پلیٹ میں رکھ کر خود کو پیش کرنے کے فن میں امی کو کمال حاصل تھا۔وہ باتوں کی ایسی ایسی جلیبیاں تلتیں کہ حد نہیں۔بالکل ہی حلوائن تھیں۔باتوں کے ہار پروتے ہوئے ایسی ایسی کلیاں ٹانک جاتیں کہ میں ششدر رہ جاتی۔دو ایک منٹ خود کو سنبھالنے میں لگتے۔

امی کو ملکیتیں گنوانے کا بڑا شوق تھا۔انہیں یہ بالکل گوارا نہ تھا کہ دوسرا بڑھ چڑھ کر بات کرے۔

زمیندار کی بات چل نکلتی تو امی جھٹ سے کسی دوردراز مقام پر اپنے چار مربعے ایجاد کر لیتی۔ہاں بہنے زمیندارے کی مصیبتوں کی حد ہے کوئی۔اپنے چار مربعے جو خیر پور کے قریب ہیں ہمارے لیے دردِ سر بنے ہوئے ہیں۔کون ہر مہینے اتنی دُور جا کر ان کی دیکھ بھال

کرے۔

ولائت میں اونچے عہدوں پر فائز رشتہ داروں کی بات چھڑ جاتی تو امی جھٹ سے ایک آئیل انجینئر کزن اختراع کر لیتیں جسے تیل کمپنی نے ہاتھ جوڑ جوڑ کر امریکہ میں روکا ہوا تھا۔ اس ڈر کے مارے کہ اگر واپس وطن چلا گیا تو کمپنی کا بھٹہ بیٹھ جائے گا نہلے پر دہلا مارنا امی کا من بھاتا مشغلہ تھا۔

لیکن وہ خالی جلیبیاں ہی نہیں تلتی تھیں۔ اس بات کا بھی خیال رکھتیں کہ ان میں کڑا کا ہو۔ ایسا جیسا ریوڑی میں ہوتا ہے۔ ابا کا طریقہ ذرا مختلف تھا۔ وہ بڑ نہیں ہانکتے تھے۔ ملکیت نہیں جتاتے تھے۔ ان کی بات میں عجیب قسم کا عجز ہوتا۔ ''میں تو کچھ بھی نہیں'' وہ اس انداز سے ادا کرتے۔۔۔ کہ سننے والوں کو لگتا جیسے بھی کچھ ہوں لیکن طبعی عجز کی وجہ سے ظاہر کرنے سے گریز کرتے تھے۔

املاک کی بات ہوئی تو مسکرا کر کہتے۔ ''جناب املاک تو شانوں پر پڑے بوجھ کی مصداق ہے۔ جو آن پڑا ہے۔ وہی نہیں اُٹھایا جاتا۔ مزید کی تمنا کون کرے۔''

خالی عجز ہی نہیں۔ ابا میں اسلام کا رنگ بھی نمایاں تھا۔ کوئی آ جاتا تو ان کا اسلام شدت سے اُبھرتا۔ یوں جیسے آنچ تیز ہو جائے تو دُودھ میں اُبال آ جاتا ہے۔

وہ مسئلے نہیں کرتے تھے۔ بحث نہیں چھیڑتے تھے۔ نہ ہی تلقین کرتے۔ اوّل تو بات میں جگہ جگہ مناسب مقام پر الحمدللہ، انشاء اللہ، بسم اللہ کی کلیاں ٹانکتے رہتے، سننے والوں کو گمان ہوتا کہ صراطِ مستقیمئے ہیں۔ مگر ہیں گپت برملا اظہار گوارہ نہیں۔ یادِ حق دل میں رہے کی مصداق۔

بہرصورت امی ابا۔ دونوں ہی حلوائی تھے۔ جلیبیاں تلنے میں تاک۔ باتوں کے دھنی اثر ڈالنے میں مشاق۔ امی بات بڑھا چڑھا کر اثر پیدا کرتی۔ ابا عجز کا پردہ ڈال کر اپنی عظمت کا جادو جگاتے۔ بات کے پسِ پشت صراطِ مستقیم کا ایسا دادرا بجاتے کہ توجہ بول سے ہٹ کر تال پر مرکوز ہو جاتی۔ بچپن میں تو یہ جلیبیاں تلنے کا شغل مجھے بہت ہی اچھا لگا۔ سوچتی کہ میں بھی کوئی اپنا منفرد انداز اپناؤں اور لوگوں کی توجہ لُوٹ کر لے جاؤں۔ لیکن جلد ہی،

جب میں جوان ہوگئی تو حلوائی کی دکان میں ایک نیا رنگ اُبھرا۔

ویسے تو گھر میں مجھے مکمل آزادی تھی۔ لیکن اگر میں کسی کلاس فیلو کی بات کرتی تو امی کے کان کھڑے ہو جاتے جھٹ پوچھتیں کس کا بیٹا ہے وہ۔ باپ کیا کام کرتا ہے۔ اس پر میں بہت حیران ہوتی۔

اس روز انور مجھے نوٹس کی کاپی دینے ہمارے گھر آیا۔ تو امی پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ گئی۔ یوں اسے دیکھنے لگی جیسے لیبارٹری میں کیڑے کو خوردبین کے نیچے رکھ کر دیکھتے ہیں۔ پھر اس پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

"تیرے ابا کیا کام کرتے ہیں۔ افسر ہیں یا زمیندار ہے۔"

انور بیچارہ بوکھلا گیا۔ وہ تو ایک بیوہ کا بیٹا تھا۔ جو محنت مزدوری کر کے اسے تعلیم دلوا رہی تھی۔ امی کی باتوں کا کیا جواب دیتا۔ بے چارہ بوکھلا گیا۔ ادھر میں حیران کہ وہ تو میری ریکویسٹ پر نوٹس کی کاپی دینے آیا ہے۔ یہ امی اس کا حسب نسب کیوں پوچھنے لگی۔

جب وہ چلا گیا تو امی نے مجھے پاس بٹھالیا۔ بولی، ایسے لڑکوں کو منہ نہ لگایا کرو۔

مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے کہا۔ امی وہ تو ہماری کلاس کا فسٹ ڈویژنر فسٹ ہے۔

پڑا ہو۔ امی نے جواب دیا۔ تم نے کیا مقابلے کا امتحان دینا ہے۔

اس وقت تو بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ پھر ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ بھانڈا پھوٹ گیا۔

ہوا یوں کہ ہمارے ساتھ والے بنگلے کی گرین کاٹیج میں نئے کرایہ دار آ گئے۔ کسی تیل کمپنی کے ڈائریکٹر تھے۔ ان کے آتے ہی گرین کاٹیج کا حلیہ بدل گیا۔ سارے گھر میں یہ موٹا کارپٹ بچھ گیا۔ کمروں میں، گیلریز میں، سیڑھیوں پر جگہ جگہ ڈیکوریشن پیسز رکھ دیئے گئے۔ سٹنگ روم کی ایک دیوار پر قد دیوار سوئٹزرلینڈ کا ایک منظر پیسٹ کر دیا گیا۔ ڈرائنگ روم میں انوکھے پودوں کے گملے رکھ دیئے گئے۔

گھر میں صرف تین افراد تھے مسٹر این عنایت ان کی بیگم آمنہ عنایت اور ان کا اکلوتا بیٹا عین۔

نئے پڑوسیوں کے آتے ہی گویا ہمارے گھر میں بھی انقلاب آ گیا۔ امی ابا جو کبھی ایک ساتھ نہ بیٹھے تھے۔ کان سے منہ لگا لگا کر باتیں کرنے لگے۔ ان کی سرگوشیوں کا انداز ایسا تھا جیسے لَو برڈز ہوں۔ یا اللہ یہ کیا ہوا۔ میں تو حیران رہ گئی۔ کیا وقت کا دھارا الٹا بہنے لگا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کون سا موضوع ہے۔ جس پر دونوں ہینڈ اینڈ گلو بنے بیٹھے ہیں۔

کئی ایک بار میں اچانک ان کے سر پر جا کھڑی ہوئی۔ مگر بے کار میری آہٹ سن کر وہ چُپ ہو جاتے اور پھر بات بدل دیتے صرف یہی نہیں ہمارے گھر میں کئی ایک اور تبدیلیاں بھی عمل میں آئیں۔ نئی سجاوٹیں۔ نئے قالین، نئے پردے۔

امّی تو گویا آمنہ عنایت پر بک گئیں۔ ہر وقت آمنہ کے تذکرے، اس کی تعریفیں ہے کتنی خوش اخلاق خاتون ہے۔ سلیقہ تو اس پر ختم ہے۔ پھر وہ دفعتاً آنٹی بن گئی۔ امی نے گرین کاٹیج کے پھیرے لینے شروع کر دیئے۔ اتنے تعلقات بڑھائے کہ تکلفات سمٹتے گئے۔ گھر میں کوئی چیز آتی آنٹی کا حصہ الگ کر دیا جاتا۔ اچھی چیز پکتی تو پہلے آنٹی کو چکھائی جاتی ہر مہینے آنٹی کی دعوت کا اہتمام کیا جاتا۔ خیر امّی کی تو عادت تھی کہ جس پر ریجھ گئی۔ اسے ماتھے پر لٹکا لیا۔ جہاں تک امّی کا سوال تھا وہ تو خیر ٹھیک تھا۔ دقّت یہ ہوئی کہ امی نے بار بار مجھے آنٹی کے ہاں بھیجنا شروع کر دیا۔ ثانیہ ذرا آنٹی سے یہ پوچھ آؤ، ثانیہ ذرا آنٹی کو یہ دے آؤ ثانیہ ذرا دیکھو تو آنٹی فارغ ہیں۔ ہائیں ثانیہ۔۔۔ تو صبح سے آنٹی کی طرف نہیں گئی۔ میں حیران کہ مجھے بار بار آنٹی کے پاس کیوں بھیجا جا رہا ہے۔ بات سمجھ میں نہ آئی۔ پھر ایک روز بلی پھدک کر تھیلے سے باہر نکل آئی۔

اس روز میں اور امی دونوں باہر پلاٹ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ امی کچھ بُن رہی تھی میں پڑھ رہی تھی۔ گرین کاٹیج کی طرف سے موٹر سٹارٹ کرنے کی آواز آئی۔ میں نے اُدھر دیکھا آنٹی اور انکل موٹر میں کہیں باہر جا رہے تھے۔

کچھ دیر کے بعد امی نے سر اٹھایا بولی ''ثانیہ ذرا آنٹی سے کنفرم کرآؤ کہ آج شام فلم کا پروگرام قائم ہے نا''۔

میں نے حیرت سے امی کی طرف دیکھا۔ میں نے کہا امی آنٹی اور انکل تو ابھی ابھی

باہر گئے ہیں۔

اچھا، وہ بولی۔ تو پھر کیا ہے۔ عین تو گھر پر ہی ہے نا اس سے کنفرم کرلو۔

دفعتاً کڑاہی میں جلیبی شوں شوں کرنے لگی۔

اچھا تو مجھے گلاب جامن بنا کر چینی کی پلیٹ میں رکھ کر عین کی خدمتِ عالیہ میں پیش کیا جارہا ہے۔ دفعتاً میری آنکھوں سے پردے ہٹ گئے۔

بلّی تھیلے سے باہر نکلی تو کیا دیکھتی ہوں کہ کڑاہی جلیبیوں سے بھری ہوئی ہے۔

ثانیہ آنٹی کے ہاں انہی کپڑوں میں جائے گی کیا۔ اچھا وہ نئی شال ہی اوڑھ لے۔

ثانیہ، تُو ذرا عین کے پاس بیٹھ میں ابھی آئی۔

بیٹی پڑھائی میں کوئی مشکل ہو تو عین سے جا کر پوچھ لیا کر۔ ایم اے ہے وہ۔ تیری آنٹی کہتی ہے ہمیشہ جماعت میں فسٹ ڈویژن لیا کرتا تھا۔

بیتی ہوئی باتیں ایک ایک کر کے سامنے آ کھڑی ہوئیں۔

ارے تو کیا یہ سب نئے ڈیکوریشنز غالیچے پردے میری ہی وجہ سے بدلے گئے تھے۔ یہ سارا ارینج منٹ مجھے عین کی جھولی میں ڈالنے کے لیے ہے اور پھر امّی ابا کی سرگوشیاں۔

اس روز حلوائی میری نگاہ میں بالکل ننگے ہو گئے۔

اگر میں خدوخالی لڑکی ہوتی تو چپکے سے گلاب جامن بن کر پلیٹ میں سج جاتی۔ مشکل یہ ہے کہ میں سیلف میڈ گرل ہوں۔ خداداد حُسن پر تکیہ نہیں کیا۔ بڑی محنت سے خود میں جاذبیت پیدا کی ہے۔ جو زورِ بازو سے بنی ہو وہ گلاب جامن نہیں بن سکتی وہ جھولی پھیلانے کی قائل نہیں ہوتی۔ اپنے ہاتھ سے توڑ کر کھانا پسند کرتی ہے۔

اگر میں چاہتی تو عین بے چارے کی کیا حیثیت تھی۔ ایسا لشکارہ مارتی کہ سُدھ بُدھ ماری جاتی۔ ایسی جلیبی بنتی جسے دیکھ کر عمر بھر منہ سے رال ٹپکتی رہتی۔ لیکن مجھے عین پسند نہ تھا۔ بھدا سا جسم۔ میڈیا کر ذہن۔ افلوانس زدہ بے حسی۔ بالکل ہی ''بڈاوا'' نظر آتا تھا اسے تو ایک گوری چٹی خدوخالی لڑکی چاہیے تھی۔ جو ہر وقت رضامندی بھری مسکراہٹ مسکاتی رہے۔ بن سج کر بیٹھی میاں کا انتظار کرتی رہے۔

وہ تو شکر ہے چند ہی دنوں میں عین کا بھید کھل گیا کہ وہ روزی کے گھر آتا جاتا ہے روزی کے گھر کو امّی اچھی طرح جانتی تھی کہ وہاں جو جاتا ہے پھر لوٹ کر نہیں آتا۔ روزی کی ایک نہیں چار جوان بیٹیاں تھیں۔ چینی کی پلیٹ میں چار گلاب جامن۔ یوں عین کا قضیہ ختم ہوا۔

پھر دفعتاً منظر بدلا۔ پڑوس میں چودھری صاحب آبسے۔

بیٹھے بٹھائے ابا کو شکار کا شوق چرایا۔ انہوں نے ایک بندوق خرید لی اور چودھری صاحب کے ساتھ باقاعدہ شکار پر جانے لگے۔ گھر میں شکار کا گوشت آنے لگا۔ پھر ڈرائنگ روم میں ہرن کے سینگ آویزاں ہو گئے۔ ایک اونچے سٹول پر بھُس بھرا عقاب آ بیٹھا۔ نیچے کارپٹ پر شیر کی کھال بچھ گئی۔ میں تو حیران رہ گئی۔ یہ کیا ہوا۔

باورچی خانے کی طرف نگاہ اٹھائی تو کیا دیکھتی ہوں کہ چولہے پر مٹی کی اتنی بڑی ہانڈی پڑی ہے۔ کونے میں دہی بلوہنے کی چاٹی رکھی ہوئی ہے۔ اور امّی نوکر سے بھینس خریدنے کے منصوبے باندھ رہی ہے۔ لو یک نہ شُد دو شُد۔

پھر اس کایا پلٹ کا بھید کھل کر سامنے آ گیا۔ چودھری صاحب اور چودھرائن ہمارے گھر کھانے پر آ گئے۔ میز پر ثابت ماش، گوشت کی کڑاہی، پائے، رس کی کھیر اور سرسوں کا ساگ۔ مکھن کے پیڑے کے ساتھ سامنے آ گئے۔

کھانے کے بعد امی نے اپنی کڑاہی چڑھا دی، کڑچھا چلنے لگا۔ امی پہلے تو جگہ جگہ اپنے مربعے قائم کرتی رہیں۔ پھر بات کا رُخ میری طرف مڑ گیا۔

ثانیہ اتنی سگھڑ ہے کہ حد نہیں۔

باورچی خانہ کا حساب کتاب بس ثانیہ ہی جانے۔

مربعوں کا حساب کتاب بس ثانیہ ہی جانے۔

جب ثانیہ چاٹی کو ہاتھ لگاتی ہے تو مکھن آپ ہی آپ پیڑا بن کر اُبھر آتا ہے۔ اوہو ۔۔۔ تو یہ بات ہے ۔۔۔ ثانیہ کو مکھن کا پیڑا بنا کر چینی کی پلیٹ میں رکھ کر چودھرائن کو پیش کیا جا رہا ہے۔ لیکن کس کے لیے یہ بھید بھی جلد کھل گیا۔

ایک روز چودھری کا بیٹا علی احمد مونچھیں لٹکائے سامنے آ بیٹھا۔ اور امی اس کے سامنے بیٹھ کر ثانیہ کی گردان پڑھنے لگی۔ علی احمد تو بالکل ہی پینیڈو تھا۔ امی کی ہر بات پر بے تکلفانہ بھونڈا قہقہہ لگاتا اور پھر کھجانے لگتا۔ اسے دیکھ کر میں تو لرز گئی۔ یا اللہ کیا میرا مستقبل کڑچھا اور کڑاہی کے زور پر ہی بنے گا۔

شاید اللہ نے میری سُن لی۔ کچھ زیادہ ہی سُن لی۔

ابا پر انکوائری انسٹیٹیوٹ ہوگئی۔ اور ان کی ساری پراپرٹی ضبط کرلی گئی۔ وہ اس صدمے کو برداشت نہ کر سکے۔ لہٰذا ہارٹ اٹیک کا شکار ہو گئے۔

امی بیچاری چار ہی دن میں مُرجھا کر رہ گئیں۔ سارا رنگ وروغن اُڑ گیا۔ نیچے سے ایک کھوسٹ بڑھیا نکل آئی۔ نہ وہ کڑاہی رہی، نہ کڑچھا نہ جلیبیاں۔

امی کو سہارا دینے کے لیے میں نے ایک دفتر میں نوکری کر لی۔ میں بھلا نوکری کے لیے کہاں ماری ماری پھرتی وہ تو اتفاق سے انور مل گیا کہنے لگا ہمارے دفتر میں ایک جگہ خالی ہے اگر چاہو تو آ کر جائن کرلو۔ یوں گھر بیٹھے بیٹھے خوانخواہ بور ہو رہی ہو۔ اسے ہمارے حالات کی خبر تھی نا۔ یوں مجھے اس کے توسط سے نوکری مل گئی۔

چار سال گزر گئے۔

شروع شروع میں دفتر میں مشکلات پیش آئیں۔ کچھ لوگوں نے سمجھا کہ اکیلی لڑکی ہے چلو قسمت آزمائیں۔ کچھ نے آگے بڑھ کر جلیبیاں تلنی شروع کیں۔ کچھ نے پھلجھڑیاں چلائیں۔ کچھ نے کبوتر سی آنکھیں بنا بنا کر دیکھنا شروع کیا۔ کچھ نے گلاب جامن کی امید پر رال ٹپکائی۔۔۔ پھر انہیں بات سمجھ میں آ گئی کہ ادھر خوش وقتی نہیں چلے گی۔ لہٰذا سب نارمل ہو گئے۔ انور دور سے ہی دیکھتا رہا۔ نہ شوراشوری نہ سردمہری یوں جیسے میں لڑکی تھی ہی نہیں۔ لیکن کبھی کبھار مجھے ایسے لگتا جیسے وہ مجھے دیکھ نہیں رہا بلکہ نگاہوں سے تول رہا ہے۔

کل شام کی بات ہے کہ انور میرے پاس آیا بولا۔ ثانیہ فارغ ہو کیا؟

کیوں؟ میں نے پوچھا۔

بولا۔ ذرا میرے ساتھ چلو۔

کہاں؟

ایک کام ہے۔

وہ اس قدر سنجیدہ تھا کہ مزید پوچھنے کی ہمت نہ پڑی اور میں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔

دفتر کے پچھواڑے کے پلاٹ میں وہ رُک گیا۔

میں حیران یا اللہ یہاں کیا کام ہوسکتا ہے بھلا۔

بیٹھ جاؤ۔ وہ بولا۔

میں پتھر کے بنچ پر بیٹھ گئی۔ وہ نگاہیں جھکائے میرے سامنے کھڑا رہا۔ دیر تک وہ خاموش رہا۔ یوں جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو لیکن کہہ نہ پاتا ہو۔

آخر وہ بولا۔ دیکھو ثانیہ میرے پاس تمہیں دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ ایک پرانا بوسیدہ گھر ہے اور ایک بوڑھی ماں ہے۔ وہ اتنی بوڑھی ہو چکی ہے کہ کام کاج کرنے کے قابل نہیں رہی۔ وہ رُک گیا۔ دیر تک رُکا رہا۔ پھر بصد مشکل بولا۔ ثانیہ تم میرے ساتھ شادی کرو گی، میں تو بکی بکی رہ گئی۔۔۔ میرے گردوپیش دُھندلکا چھا گیا۔ پھر اس دھندلکے میں سے انور کی آواز آئی۔

سوچ لو ثانیہ سوچ لو۔ اگر تمہیں گوارہ ہو تو مجھے بتا دینا۔ میں انتظار کروں گا۔

پھر اس دھندلکے میں سے ایک دیا اُبھرا۔۔۔ اُبھرتا چلا گیا۔

مجھے پتہ نہیں میں وہاں کتنی دیر بیٹھی رہی۔ بس بیٹھی رہی۔ مجھے خیال بھی نہ تھا کہ انور شادی کا پیغام دے گا۔

کل سے میں ڈور کے گچھے کی طرح الجھی بیٹھی ہوں کوئی سرا نہیں ملتا۔

زندگی بھر مجھے تمنا رہی کہ کوئی مجھ سے سیدھی اور صاف بات کرے۔ سچی بات کرے۔ سچی بات ہونٹوں سے نہیں۔۔۔ زندگی بھر میری خواہش رہی کہ مجھے چینی کی پلیٹ میں رکھا ہوا گلاب جامن نہ سمجھا جائے۔۔۔ لیکن اب انور کی بات سننے کے بعد مجھے سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا کروں۔۔۔ دھندلکا بڑھتا جا رہا ہے۔۔۔ لیکن وہ مدھم سا دیا۔

امی سے بات کروں۔ وہ تو کرنی ہی پڑے گی۔ کروں گی۔ امی بیچاری کا کیا ہے۔ وہ امی تو رہی ہی نہیں۔ نہ تاج رہا نہ تخت بیچاری سارا دن دھوپ میں کھاٹ پر بیٹھ رہتی ہے۔ کسی بات میں دخل نہیں دیتی۔ منہ پر یوں جُھریاں پڑ گئی ہیں۔ جیسے کوئی بلوری گلدان ریزہ ریزہ ہو جائے لیکن ریزے الگ نہ ہوں چمٹے رہیں۔ اور ایسا لگے کہ ہاتھ لگایا تو گر کر ڈھیر ہو جائیں گے۔

میں اٹھ کر امی کے پاس جاتی ہوں۔۔۔ امی جان۔۔۔ امی جان چونکتی ہیں میری طرف دیکھتی ہیں۔

امی ہمارے دفتر کا ایک لڑکا آپ سے ملنا چاہتا ہے۔

امی یہ سن کر بالکل ہی دھندلا جاتی ہے۔ مجھ سے۔۔۔۔!

''جی امی۔''

امی حیرت سے میری طرف دیکھتی ہیں۔

امی اس کا باپ فوت ہو چکا ہے۔ ماں بہت بوڑھی ہے آ نہیں سکتی۔ اس لیے وہ لڑکا خود ہی آئے گا۔

دفعتاً امی کی آنکھ میں چمک لہراتی ہے۔ اچھا۔

میں کوشش کرتی ہوں کہ شرماؤں نہیں۔ امی وہ لڑکا پیغام دینا چاہتا ہے۔

امی کا سارا چہرہ دمک اُٹھتا ہے۔ چہرے کی سلوٹیں سمٹ کر ناپید ہو جاتی ہیں۔ گردن کھٹک سے اُبھرتی ہے اور وہ یوں اُٹھ کر بیٹھ جاتی ہے جیسے آج سے چار سال پہلے کی امی ہوں۔

کون ہے وہ، امی پوچھتی ہے۔ پھر قریب ہو کر زیرِ لب کہتی ہے کتنے مربعے ہیں۔

میں ہکی بکی رہ جاتی ہوں۔ نہیں امی، میرے منہ سے نکل جاتا ہے۔

تو کیا کوئی بڑا افسر ہے؟ وہ پوچھتی ہیں۔

اب میں کیا جواب دوں۔

افسر نہیں تو کیا کاروبار ہے۔ کارخانے دار ہے۔

میں یوں کھڑی کی کھڑی رہ جاتی ہوں جیسے پتھر کی بن گئی ہوں۔ مجھے خاموش دیکھ کر امی کہتی ہیں، اسے کہنا کل کسی وقت مجھ سے مل لے۔ میں کرلوں گی اس سے بات۔

جب سے میں نے امی سے بات کی ہے اس کی تو کایا پلٹ گئی ہے۔ بیٹھی سوچ رہی ہے۔ اپنی پُرانی زنگ آلود کڑاہی اور کڑچھا صاف کر رہی ہے۔ حالانکہ اسے اچھی طرح علم ہے کہ چولہے تلے آگ نہیں کڑاہی میں تیل نہیں لیکن وہ یوں بیٹھی ہے جیسے جلیبیاں تلنے کی مشق کر رہی ہو۔ اسے دیکھ کر میرے اردگرد کا دھندلکا بڑھتا جارہا ہے، بڑھتا جارہا ہے۔ اور وہ دیا۔ یوں جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہو۔۔۔ مجھے اس دیئے پر ترس آجاتا ہے اور میں خود پھونک مار کر اسے بجھا دیتی ہوں۔ تاکہ خود کو محفوظ کرلوں۔

-☆-

وقار محل کا سایہ

وقار محل کی چھتیں گر چکی ہیں۔ لیکن دیواریں جوں کی توں کھڑی ہیں۔ جنہیں توڑنے کے لیے بیسیوں جوان مزدور کئی ایک سال سے کدال چلانے میں مصروف ہیں۔

وقار محل نیو کالونی کے مرکز میں واقع ہے۔ نیو کالونی کے کسی حصے سے دیکھئے۔ کھڑکی سے سر نکالئے، روشن دان سے جھانکئے۔ ٹیرس سے نظر دوڑائیے۔ ہر صورت میں وقار محل سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ مضبوط ویران بوجھل رعب دار، ڈراؤنا، سر بلند کھوکھلا عظیم۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساری نیو کالونی آسیب زدہ ہو اور وقار محل آسیب ہو۔

نوجوان دیکھتے ہیں تو دلوں میں غصہ اُبھرتا ہے۔ نیو کالونی کے چہرے کا پھوڑا۔ رستی بستی کالونی میں آثارِ قدیمہ۔ چہرے نفرت سے بگڑ جاتے ہیں۔ ہٹاؤ اسے۔ لیکن وہ محل سے اپنی نگاہیں ہٹا نہیں سکتے۔

بچے دیکھتے ہیں تو حیرت سے پوچھتے ہیں۔ ڈیڈی یہ کیسی بلڈنگ ہے، بھدی، بے ڈھب موٹی موٹی دیواریں۔ اُونچی اُونچی چھتیں، تنگ تنگ کھڑکیاں۔ اور ڈیڈی کیا یہ لوہے کی بنی ہوئی ہے۔ اتنے سارے مزدوروں سے بھی نہیں ٹوٹ رہی۔

بڑے بوڑھے محل کی طرف دیکھتے ہیں تو۔۔۔۔ لیکن بڑے بوڑھے تو اس طرف دیکھتے ہی نہیں۔ انہیں دیکھنے کی کیا ضرورت ہے وہ تو رہتے ہی محل میں ہیں چوری چھپے۔ وہ ڈرتے ہیں کہ کسی پر بھید کھل نہ جائے۔

کالج کے لڑکے جو اس کھوکھلے محل کے زیرِ سایہ پل کر جوان ہوئے ہیں۔ وقار محل کا مذاق اُڑاتے ہیں اب تو خالی دیواریں رہ گئی ہیں۔ کچھ دنوں کی بات اور ہے۔ لیکن ان کے

دلوں سے آواز اُبھرتی ہے اور وہ تالیاں پیٹنے لگتے ہیں قہقہے لگانے لگتے ہیں تا کہ وہ آواز ان میں دب کر رہ جائے۔ بہر حال نیو کالونی کا ہر نوجوان وقار محل سے ایک پُر اسرار لگاؤ محسوس کرتا ہے۔ اگر چہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ لگاؤ نہیں لاگ ہے۔ لیکن اسے پتہ نہیں ہے کہ لاگ تو لگاؤ کا ایک رُوپ ہے۔ ڈھکا چھپا شدّت بھرا لگاؤ۔

وقار محل صدیوں سے وہاں کھڑا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کب تعمیر ہوا تھا۔ جب سے لوگوں نے ہوش سنبھالا تھا اسے وہیں کھڑے دیکھا تھا۔

پہلے تو لوگ وقار محل پر فخر کیا کرتے تھے پھر نئی پود نے مذاق اُڑانا شروع کر دیا۔ پھر کسی منچلے نے بات اُڑا دی کہ محل کی دیواروں میں دراڑیں پڑ چکی ہیں۔ چھتیں بیٹھ رہی ہیں۔ وہ نیو کالونی کے لیے خطرہ ہے اس پر کمیٹی والے آ گئے۔ انہوں نے چاروں طرف سے محل کی ناکہ بندی کر دی۔ اور جگہ جگہ بورڈ لگا دیے۔ خبردار۔ دُور رہیے عمارت گرنے کا خطرہ ہے۔ پھر بیسیوں مزدور کدال پکڑے آ پہنچے اور محل کی چھتوں اور دیواروں کو توڑ توڑ کر گرانے لگے۔

پتہ نہیں بات کیا ہے کہ سالہا سال سے اتنے سارے لوگ کدال چلا رہے ہیں اسے توڑنے میں لگے ہیں لیکن پھر بھی محل کا کچھ نہیں بگڑا وہ جوں کا توں کھڑا ہے۔ پتہ نہیں وہ کسی مصالحے سے بنا ہے کہ اسے منہدم کرنا آسان نہیں۔

بہر حال۔ سارا دن مزدور کدال چلاتے رہتے ہیں۔ نیو کالونی میں آوازیں گونجتی رہتی ہیں۔ ٹھک ٹھکا ٹھک، ٹھک ٹھکا ٹھک۔

یہ ٹھک ٹھک پُھمی کی رانوں میں گونجتی ہے اس کی لرزش سے کوئی پوشیدہ سپرنگ کھلتا ہے کوئی پُر اسرار گھڑی چلنے لگتی ہے۔ اس کی ٹِک ٹِک دل میں پہنچتی ہے دل میں لگا ہوا ایمپلی فائر اسے سارے جسم میں اُچھال دیتا ہے۔ ایک بھونچال آ جاتا ہے چھاتیوں سے کچا دُودھ رسنے لگتا ہے، ہونٹ لمس کی آرزو سے بوجھل ہو کر لٹک جاتے ہیں، نسیں تن جاتی ہیں اور سارا جسم یوں بجنے لگتا ہے جیسے سارنگی ہو۔

اس پر پُھمی دیوانہ وار کھڑکی کی طرف بھاگتی ہے اور وقار محل کی طرف یوں دیکھنے لگتی ہے جیسے اس سے پوچھ رہی ہو اب میں کیا کروں؟

والدین نے جھّی کا نام یاسمین رکھا تھا۔ بچپن میں سب اسے یاسمین کہتے تھے۔ پھر جب وہ ہائی سکول میں پہنچی تو اس نے محسوس کیا کہ یاسمین دقیانوسی نام ہے۔ اس سے پرانے زمانے کی بُو آتی ہے یہ نام ہے بھی تو سلوٹمپو۔ یاسمین۔ ڈھیلا ڈھیلا جیسے چولیس ڈھیلی ہوں۔ لہٰذا اس نے یاسمین کی چولیں ٹھونک کر اسے جس من کر دیا۔ پھر جب وہ کالج میں پہنچی تو اسے پھر سے اپنے نام پر غصہ آنے لگا۔ لو میں کیا پھول ہوں کہ جس من کہلاؤں۔ میں کیا آرائش کی چیز ہوں۔ میں تو ایک ماڈرن گرل ہوں اور ماڈرن گرل پھول نہیں ہوتی آرائش نہیں ہوتی۔ خوشبو نہیں ہوتی۔ یہ سب تو دقیانوسی چیزیں ہیں۔ ماڈرن گرل تو ایکٹو ہوتی ہے سمارٹ ہوتی ہے۔ جیتی جاگتی چلتی پھرتی جس پر زندگی بیتتی نہیں بلکہ جو خود زندگی بیتتی ہے۔ لہٰذا اس نے اپنا نام جس من سے جھّی کر لیا۔ جھّی۔ فٹ۔ فٹافٹ۔ فوراً۔ یہ نام کتنا فعال تھا۔ کتنا سمارٹ۔ اس میں زندگی کی تڑپ تھی۔ پھر اس نام کے زیر اثر جلد ہی اس میں یہ خواہش اُبھری کہ کچھ ہو جائے۔ ابھی ہو جائے۔ ابھی ہو جائے فوراً۔ تو ابتدا تھی۔ بالآخر جھّی چاہنے لگی کہ کوئی ایسی بات نہ ہو جو ہونے سے رہ جائے۔

لیکن اس روز جب کہ کچھ بلکہ بہت کچھ ہو گیا تھا یہاں تک ہو گیا تھا جس کی اسے توقع نہ تھی۔ لیکن وہ خوشی محسوس نہیں کر رہی تھی۔ الٹا وہ تو ہاتھ مل رہی تھی کہ یہ کیا ہو گیا۔ پتہ نہیں اس روز جھّی کو کیا ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھیں پُرنم تھیں۔ وہ حسرت آلود نگاہوں سے وقار محل کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ دوڑ کر وقار محل میں جا پناہ لے اس روز جیسے جھّی پھر سے یاسمین بن گئی تھی۔

اگرچہ شعوری طور پر جھّی کو وقار محل سے سخت چڑ تھی اور وہ اسے اپنے راستے کی رُکاوٹ سمجھتی تھی لیکن دل کی گہرائیوں میں وقار محل اس کے بنیادی جذبات پر مسلط تھا۔ اَن جانے میں وہ اس کی زندگی پر یوں سایہ کیے ہوا تھا، جیسے بڑ کا درخت کسی گلاب کی جھاڑی پر سایہ کیے ہوئے ہو۔

جھّی وقار محل کے زیرِ سایہ پیدا ہوئی تھی۔ وہیں کھیل کھیل کر جوان ہوئی تھی۔ اس کی کوٹھی ایور گرین وقار محل کے عقب میں تھی۔ اس کی تمام تر کھڑکیاں محل کی طرف کھلتی تھیں۔

دونوں ٹیرسیں اُدھر کو نکلی ہوئی تھیں۔ بچپن میں جب وہ یاسمین تھی تو وقار محل اس کے لیے جاذبِ نظر اور قابلِ فخر چیز تھی پھر جوں جوں وہ جوان ہوتی گئی وقار محل اسے بوسیدہ عمارت نظر آنے لگی جو نیو کالونی کے راستے کی رکاوٹ تھی۔ اس کے دل میں یہ گماں بڑھتا گیا کہ وقار محل نوجوانوں کی آزادی کچلنے کے لیے تعمیر ہوا تھا۔ وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ گرتے ہوئے وقار محل کا سایہ اس کے دل کی گہرائیوں پر چھایا ہوا ہے اور اس کی زندگی کے ہر اہم واقعے میں وقار محل کا حصہ تھا۔

مثلاً جب اس میں جوانی کی اولیں بیداری جاگی تھی تو گرتے ہوئے وقار محل کی ٹھک ٹھک نے ہی تو اسے جھنجھوڑ کر جگایا تھا۔ اسے وہ دن اچھی طرح یاد تھا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ ابھی جس مَن تھی یِفّی نہیں بنی تھی۔ اگرچہ اس کی باجی عفت مدت سے عفت سے اِف اور پھر اِف سے اِفّی بن چکی تھی۔ چونکہ اِف بٹ کا امکان خارج ہو چکا تھا۔

ان دنوں باجی سارا سارا دن اپنے بیڈ پر اُوندھے منہ پڑی رہتی تھی۔ پتہ نہیں اسے کیا ہو گیا تھا۔ افی باجی تو بیڈ پر ڈھیر ہونے والی نہ تھی۔ اس کی تو بوٹی بوٹی تھرکتی تھی۔ ابھی یہاں کھڑی ہے۔ ابھی باغیچے میں جا پہنچی۔ لو وہ تو ٹیرس پر ٹہل رہی ہے۔ ہائیں وہ تو چلی بھی گئی۔ کسی گیٹ ٹو گیدر میں۔ کسی فنکشن میں۔ کسی پارٹی میں۔ ایک جگہ ٹک کر بیٹھنا افی باجی کا شیوہ نہ تھا۔ پھر پتہ نہیں ان دنوں اسے کیا ہو گیا تھا کہ پلنگ پر گٹھڑی بن کر پڑی رہتی تھی۔ جس مَن سمجھتی تھی کہ افی باجی میں واسکوڈے گاما کی روح ہے۔ اسے خبر نہ تھی کہ واسکوڈے گاما نے امریکہ دریافت کر لیا ہے اور اب تھک ہار کر پڑ گئی ہے۔

ان دنوں ممی بار بار افی کے بیڈ کے دروازے سے چھپ چھپ کر جھانکتی اور حیرت سے باجی کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ باجی سے پوچھ نہیں سکتی تھی۔ پوچھنا الگ رہا ممی تو باجی سے بات نہیں کر سکتی تھی۔ کیسے کرتی بات، بات کرتی تو باجی تنک کر کہتی۔ ممی ڈارلنگ آپ نہیں سمجھتیں آپ نہ بولیں۔ واقعی ممی نہیں سمجھتی تھی۔ کیسے سمجھتی وہ تو بیچاری سیدھی سادی امی تھی جسے حالات نے زبردستی ممی بنا دیا تھا۔

جب فاطمہ بیگم کی شادی محمد عثمان سے ہوئی تھی تو وہ اسسٹنٹ تھے پھر حالات نے سرعت سے پلٹا کھایا اور وہ مینجر ہو گئے اور اب جنرل مینجر تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ محمد عثمان سے ایم اوثمان ہو گئے تھے۔ لیکن فاطمہ بیگم فاطمہ بیگم ہی رہی تھی۔ وہ فاطمہ زیادہ تھی اور بیگم کم۔ تعلیم سرسری تھی۔ سوشل سٹیٹس کی بھاری بھرکم گٹھڑی سر پر آ پڑی پھر بھی جوں توں کر کے اس نے رہن سہن کی تبدیلی کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لیا تھا۔ لیکن وہ اپنی شخصیت کو بیگم کا رنگ نہ دے سکی تھی۔

اس پر ایم اوثمان اگر بیگم سے مایوس ہو گئے تھے تو اس میں ان کا کوئی قصور نہ تھا۔ پھر جو انہوں نے گھر سے ناطہ توڑ لیا اور کلب میں وقت بسر کرنے لگے تو یہ ایک قدرتی امر تھا۔ اس کے علاوہ کلب میں بہت سی بیگمات آتی تھیں جن پر چوکھا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ اس کے بعد فاطمہ بیگم گھر میں یوں کونے سے لگ گئی جیسے نیو کالونی کا رابنسن کروسو ہو۔ پھر لڑکیاں جوان ہوئیں تو انہوں نے اسے بالکل ہی بے زبان کر دیا۔

لڑکیوں نے زبردستی اسے ممی بنا لیا۔ ممی کے لفظ سے فاطمہ کو بڑی چڑ تھی۔ کتنا ننگا لفظ ہے۔ اس لفظ سے ننگے پنڈے کی بھڑاس آتی تھی۔ لیکن وہ احتجاج نہیں کر سکتی تھی۔ جب اپنی پیٹ جائیاں بار بار کہیں ممی ڈارلنگ آپ کو نہیں پتہ آپ نہ بولیں پلیز تو ماں کی زبان پر مہر نہ لگے تو کیا ہو۔ پہلے تو فاطمہ کو شک پڑنے لگا کہ شاید واقعی اسے پتہ نہیں۔ پھر اسے یقین آ گیا کہ اسے پتہ نہیں۔ وہ نہیں جانتی۔ کبھی کبھار اس کے دل میں خواہش پیدا ہوتی کہ جانے سمجھے۔ بولے یا نہ بولے پر کم از کم جان تو لے۔

ان دنوں اسی خواہش کے زیرِ اثر فاطمہ، اِفعی کے کمرے کے دروازے سے کان لگا کر کھڑی رہتی تھی۔ اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اِفعی اوندھے منہ بستر پر پڑی رہے۔ یوں پڑی رہے جیسے مصالحے کے بے ہوئے مُنّے کا اعضاء کو جوڑنے والا دھاگا ٹوٹ گیا ہو۔

پھر پتہ نہیں کیا ہوا۔ شاید فاطمہ کو بات سمجھ میں آ گئی وہ دیوانہ وار بھاگی۔ غیر از معمول وہ سیدھی اِفعی کے ڈیڈی کے پاس پہنچی پھر غیر از معمول میاں بیوی آپس میں سرگوشیاں

کرتے رہے۔ ان سرگوشیوں کے دوران میں میاں اہم اہم کرتے سنے گئے۔ اہم اہم کرنا تو انہوں نے مدّت سے چھوڑ رکھا تھا۔ ان کے اہم اہم کرنے سے معلوم ہوتا تھا جیسے گھر میں پھر سے محمد عثمان آ گیا ہو۔

کچھ دیر کے بعد کمرے کا دروازہ کھلا محمد عثمان باہر نکلے۔ ان کے سر پر ٹوپی تھی اور ہاتھ میں چھڑی پیچھے پیچھے فاطمہ تھی۔ وہ بڑے وقار سے قدم اٹھاتے ہوئے سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ افعی کے بیڈروم میں داخل ہو کر انہوں نے اندر سے کنڈی چڑھا دی۔

جس من یہ سب تفصیلات کانی آنکھ سے دیکھ رہی تھی۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ ڈیڈی اور اہم اہم کر کے بات کریں۔ پھر انہوں نے ٹوپی کیوں پہن رکھی تھی اور ان کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ان کی آواز میں بڑا تحکم تھا۔ یا شاید منّت تھی۔ یا شاید دونوں ملے جلے تھے۔ منّت بھرا تحکم یا تحکم بھری منّت۔

پھر باجی کی غصے سے بھری آواز سارے گھر میں گونجی۔ بچہ میرا ہے۔ میں اسے اپناؤں گی۔ دیکھوں گی مجھے کون روکتا ہے۔

جس من سوچنے لگی یا اللہ باجی کس بچے کی بات کر رہی ہے۔ کمرے میں تو صرف باجی، ممی اور ڈیڈی تھے۔ بچہ کہاں تھا۔

پھر اوپر کوئی کسی کو زدوکوب کر رہا تھا۔ چھڑی چلنے کی آوازیں آ رہی تھیں ساتھ ہی باجی چیخ رہی تھی رو رہی تھی کراہ رہی تھی۔

ہائے بیچاری باجی۔ جس من کے دل میں ڈیڈی کے خلاف غصہ کھولنے لگا۔

پھر پٹاخ سے دروازہ کھلا اور ڈیڈی اور امی سیڑھیاں اتر رہے تھے۔ لیکن وہ اس قدر گھبرائے ہوئے کیوں تھے۔۔۔ اوفو۔۔۔ ڈیڈی کا چہرہ لہولہان ہو رہا تھا۔ ارے ڈیڈی نے سٹک سے پیٹا تو باجی کو تھا پھر ڈیڈی کا اپنا چہرہ کیوں سوجا ہوا تھا۔ جگہ جگہ سے خون کیوں رِس رہا تھا اور وہ اس قدر کھوئے ہوئے کیوں تھے کہ کمرے میں داخل ہونے کی بجائے سیدھے کوٹھی سے باہر نکل گئے تھے۔ جس من ان کے پیچھے پیچھے گئی تھی۔

دھڑ ادڑ اڑام۔۔۔

ایک زبردست دھماکا ہوا۔

چاروں طرف سے شور اُٹھا۔

وقار محل کی چھت گر گئی وقار محل کی چھت گر گئی۔

گرد و غبار کا ایک بادل اُٹھا اور اس نے نیو کالونی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

اسی شام کو باجی ہمیشہ کے لیے گھر چھوڑ کر چلی گئی۔

ہاں، جسمن کو وہ دن اچھی طرح یاد تھا۔

اس حادثہ کے بعد وہ روز کھڑکی میں کھڑی ہو کر سوچتی رہی کہ باجی گھر چھوڑ کر کیوں چلی گئی تھی اور اس روز وہ کس بچے کی بات کر رہی تھی۔ اور ڈیڈی کا منہ لہولہان کیوں تھا اور وقار محل کی چھت کیوں گری تھی۔ وہ وقار محل کی طرف دیکھتی رہی اور سوچتی رہی۔ دیکھتی اور سوچتی رہی۔ غالباً وہ محسوس کرتی تھی کہ وقار محل اس راز سے واقف تھا۔

پھر ایک روز جب وہ کھڑکی میں کھڑی تھی تو کسی نے چلّا کر کہا۔ ہائی۔ وہ ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔

اگلے دن پھر ہائی کی آواز آئی اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ پھر چاروں طرف دیکھا۔ لیکن کوئی نظر نہ آیا۔

تیسرے دن وہ ہائی اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ دو چھوٹی چھوٹی مونچھیں نیچے کو لٹک رہی تھیں۔ جس میں سے چٹے سفید دانت چمک رہے تھے۔ اوپر دو چندھیائی سی آنکھوں میں سے گلیڈ آئی چاند ماری کر رہی تھی۔ اور اس کے اوپر بال ہی بال، بال ہی بال۔

پہلی مرتبہ ہائی کو دیکھ کر وہ سخت گھبرا گئی اس کا جی چاہا کہ شرما کر منہ موڑ لے۔ جس طرح ماہ رو شرما کر منہ موڑ لیا کرتی تھی۔

ماہ رو گوری چٹی پٹھانی تھی۔ جو اپنے باپ کے ساتھ وقار محل سے ملحقہ آوٹ ہاؤس میں رہتی تھی۔ اس کا باپ وقار محل کا چوکیدار تھا اور اب محل کے ملبے کی رکھوالی کرتا تھا۔ ماں مر چکی تھی صرف ایک چھوٹا بھائی تھا۔ سارا دن ماہ رو، روٹی ہانڈی میں مصروف رہتی۔ دوپہر کو

فراغت ہوتی تو باہر دھوپ میں آ بیٹھتی۔ ماہ رو اتنی گوری تھی۔ اتنی گوری تھی کہ ہر راہ رو اُسے دیکھ کر رُک جاتا۔ جب وہ محسوس کرتی کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے تو اس کا سارا چہرہ گلابی ہو جاتا۔ جیسے کسی نے رنگ کی پچکاری چلا دی ہو۔ پتہ نہیں حیا اس قدر گلابی کیوں ہوتی ہے۔
جس من نے کئی مرتبہ ماہ رو کو شرماتے دیکھا تھا۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ بھی حیا کے غازے کو اپنا لے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ ایک ماڈرن لڑکی تھی۔ ماہ رو کی طرح گنوار نہ تھی۔ اور ماڈرن گرل کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ شرما کر منہ موڑ لے۔ اُلٹا اسے تو ہائی کے جواب میں ہائی کہنا چاہیے۔

جب پہلی مرتبہ ہائی جس من کے سامنے آئی تو اس نے بڑی جرأت سے کام لیا اور شرما کر منہ نہ موڑا۔ لیکن اس میں اتنی جرأت پیدا نہ ہو سکی کہ جواب میں ہائی کہتی۔
دراصل جس من بڑی مخلص سچی اور شرمیلی لڑکی تھی۔ جس طرح ساری ماڈرن گرلز ہوتی ہیں لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ اس کے دل میں کئی ایک خوش فہمیاں رچی بسی ہوئی تھیں۔ جس طرح ماڈرن گرلز کے دلوں میں خوش فہمیاں رچی بسی ہوتی ہیں۔ مثلاً اسے کچھ پتہ نہ تھا لیکن وہ سمجھتی تھی کہ اسے سب پتہ ہے۔ چونکہ ماڈرن گرل کو سب پتہ ہونا چاہیے۔ چاہنے اور ہے میں جو فرق ہے اسے اس کا احساس نہ تھا۔ شعور نہ تھا۔
اس کا دل بہت سے بندھنوں سے جکڑا ہوا تھا۔ مگر وہ سمجھتی تھی کہ وہ آزاد ہے۔ چونکہ ماڈرن گرل پر لازم ہے کہ وہ آزاد ہو۔ بغضوں سے آزاد۔ لگاؤ سے آزاد۔ رسمی قید و بند سے آزاد۔

اگر چہ ذہنی طور پر اسے رجعت پسندوں کے خلاف زبردست چڑ تھی جیسے کہ ماڈرن گرل کو ہونی چاہیے لیکن دلی طور پر اسے اپنے ماں باپ سے لگاؤ تھا۔ اگر چہ اسے اس کا شعور نہ تھا۔ شعور کیسے ہوتا جب بھی ایسی صورت حال پیدا ہوتی کہ شعور ہونے کا خطرہ لاحق ہو تو وہ اپنی توجہ کسی دوسری بات پر مبذول کر دیتی۔ چونکہ سب سے اہم بات یہ تھی کہ اسے یہ شبہ نہ پڑ جائے کہ اس کے برتاؤ کی کوئی تفصیل ایسی بھی ہے جو ماڈرن گرل کے شایان شان نہیں۔

ان دنوں اسے یہی ایک فکر دامن گیر تھا کہ وہ کوئی ایسی بات نہ کرے جو ماڈرن گرل کی شان کے منافی ہو۔ اس ہائی نے اسے خاصا درہم برہم کر دیا تھا۔ لیکن وہ بات تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھی کہ وہ درہم برہم ہے۔ اتنی چھوٹی سی بات ماڈرن گرل کو بھلا کیسے درہم برہم کر سکتی ہے۔ لہٰذا وہ درہم برہم نہیں تھی۔ بالکل نہیں تھی۔

پہلی مرتبہ تو اس ہائی نے وقار محل سے سر نکالا تھا۔ پھر وہ جگہ جگہ سے سر نکالنے لگی۔ جب وہ کالج بس میں سوار ہوتی تو وہ بس سٹیڈ سے سر نکالتی۔ جب جس من کالج کی گراؤنڈ میں ٹہل لگاتی تو وہ پردۂ دیوار سے جھانکتی۔ جب وہ مارکیٹ جاتی تو وہ اس کا پیچھا کرتی۔

ہاں صورتِ حال بہت ہی خراب ہوئی جا رہی تھی پھر اس کے اپنے جسم نے بغاوت کر دی۔

ان دنوں وقار محل میں مزدوروں نے دیواریں توڑنے کا کام شروع کر رکھا تھا۔ ان کی ٹھک ٹھک ساری نیو کالونی میں گونجتی رہتی تھی۔

ایک دن جب جس من کی طبیعت ناساز تھی اور وہ بیڈ پر لیٹی ہوئی اس ہائی کے متعلق سوچ رہی تھی تو دفعتاً وہ حادثہ عمل میں آ گیا۔

ساری شرارت مزدوروں کی اس ٹھک ٹھک کی تھی روز تو وہ ٹھک ٹھک جس من کے کمرے کی دیواروں سے ٹکرا کر گونجتی تھی اس روز نہ جانے کیا ہوا وہ ٹھک ٹھک سیدھی جس من کی رانوں سے آ ٹکرائی۔ اور اس کے جسم میں گونجنے لگی۔

جس من کے جسم میں ایک عجیب سی لرزش جاگی۔ کسی پوشیدہ سرنگ میں حرکت ہوئی۔ ایک تناؤ سا اٹھا۔ اس نے دل پر دباؤ ڈالا۔ دل کے ایمپلی فائر نے اسے اُچھالا۔ سارے جسم میں ایک بھونچال سا آ گیا۔ نسیں تن گئیں۔ چھاتیوں سے کچا دودھ رسنے لگا۔ ہونٹ لمس کی آرزو سے بے حال ہو کر لٹک گئے۔ سارا جسم سارنگی کی طرح بجنے لگا۔

اس لمحے میں اسے سب پتہ چل گیا۔ سب کچھ کہ باجی گھر چھوڑ کر کیوں چلی گئی تھی کہ وہ کس بچے کی بات کر رہی تھی کہ بچہ کہاں تھا۔ سب کچھ اس روز وہ جس من سے جھی بن گئی تھی۔ اس کے دل میں شدت سے آرزو پیدا ہوئی۔ ابھی اسی وقت۔ فٹافٹ۔ جلدی کچھ ہو

جائے۔اور واقعی کچھ ہو گیا۔

اسی رات جگی کے بیڈروم کا وہ دروازہ آہستہ سے کھلا جو کوٹھی کے احاطے میں کھلتا تھا اور زیرِ لبی آواز آئی۔۔۔ہائی

جگی تڑپ کر مڑی۔

دو لٹکی ہوئی مونچھوں میں چٹے سفید دانت چمک رہے تھے۔

اگلے روز گینی لٹکتی ہوئی مونچھوں میں چٹے سفید دانت نکالے۔ چندھیائی ہوئی مگر چڑھ جانے والی سرخ چیونٹیوں جیسی آنکھیں لیے سر پر کالے بالوں کا ٹوکرا اُٹھائے صدر دروازے کے راستے سے ایورگرین میں آداخل ہوا۔

جب گینی پیدا ہوا تھا تو وہ لڑکا تھا۔اس کی پیدائش پر ماں باپ نے بڑی خوشیاں منائیں تھیں۔

انہوں نے اس کا نام غنی رکھا تھا۔لیکن جب وہ نوجوانی اور دورِ جدید میں داخل ہوا تو بہت سی تبدیلیاں عمل میں آ گئیں۔ بال بڑھ کر ٹوکرا بن گئے۔ مونچھیں لٹک گئیں۔ منہ پر پاؤڈر سرخی کی تہہ چڑھ گئی۔ رنگ دار قمیض چمکیلی صدریاں منکوں کی مالائیں اور جانے کیا کیا۔ یوں وہ غنی سے گینی بن گیا تھا۔

ایورگرین میں گینی کی آمد سے کوئی ہلچل پیدا نہ ہوئی۔ پہلے ہی اس سلسلے میں افعی نے بڑی کارکردگی دکھائی تھی۔ اس کے بوائے فرینڈ ایورگرین میں اکثر آیا کرتے تھے اور وہ بڑے شوق سے ان کا ڈیڈی سے تعارف کرایا کرتی تھی۔ ممی سے نہیں چونکہ ممی ڈارلنگ تو سمجھتی نہیں تھی اور اسے سمجھانا بہت مشکل تھا۔

فاطمہ نے گینی کو دیکھا تو سینہ تھام کر رہ گئی۔ افعی کے متعلقہ پرانے زخم پھر سے ہرے ہو گئے۔ اس کے دل میں ازسرِنو خدشات نے سر اُبھارا۔ لیکن وہ بولی نہیں۔ کیسے بولتی۔

رہے ڈیڈی۔ ڈیڈی کی سب سے مشکل یہ تھی کہ وہ فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ انہیں ایم اوتھمان بن کر جینا ہے یا محمد عثمان بن کر۔

ان کی تعلیم، سٹیٹس اور پوزیشن اس بات کے مقتضی تھے کہ وہ ایم اوتھمان بن کر زندگی

گزاریں اسی وجہ سے خاصی محنت کر کے وہ ایم اوثمان بنے تھے لیکن کئی بار بیٹھے بٹھائے محمد عثمان ان کے دل میں یوں گھس آتا جیسے ہاتھی چینی کی دکان میں آگھسا ہو۔

محمد عثمان بڑا ضدی تھا غصیل تھا منہ پھٹ تھا کٹڑ تھا۔ ایم اوثمان اسے سمجھاتے۔ دلیلیں دیتے۔ بھئی زمانہ دیکھو۔ زمانے کا رنگ دیکھو۔ آج کے تقاضوں پر غور کرو اب یہ پرانی باتیں نہیں چلیں گی لیکن محمد عثمان اپنی بات پر اڑا رہتا۔ اس لحاظ سے ایم اوثمان بھی گویا ماڈرن گرل تھے۔ ان کی شخصیت کی اوپر والی سطح پر ایم اوثمان کی جھال تھی لیکن دل کی گہرائیوں میں محمد عثمان براجمان تھے۔

جب گینی کا تعارف ایم اوثمان سے کرایا گیا تو محمد عثمان نے ان کے کان میں کہا۔ دھیان کرنا کہیں پھر سے تمہیں سر پر ٹوپی رکھ ہاتھ میں چھڑی پکڑ بیٹی کے کمرے میں جانا نہ پڑے۔ ایم اوثمان کو اس بات پر غصہ آیا۔ ہٹ جاؤ اس نے چلا کر کہا۔ میرا دل پراگندہ نہ کرو۔

پھر وہ گینی سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ آیا کرو۔ مسٹر گینی جب بھی فرصت ملے آجایا کرو۔

گینی ایور گرین میں کبھی صدر دروازے سے داخل نہ ہوتا اس کے لیے تو صرف عقبی دروازہ ہی موزوں تھا۔ لیکن جھمی کو یہ گوارا نہیں تھا۔ وہ ایک ماڈرن گرل تھی اور ماڈرن گرل ''سلائی'' تعلق رکھنے سے نفرت کرتی ہے۔ اس سے اس کی آزاد طبیعت پر حرف آتا ہے۔ اس کی انا مجروح ہوتی ہے۔ ڈھکے چھپے تعلق تو وہ پیدا کرتی ہیں جن پر بندشیں عائد کی جاتی ہیں، جو پابندیوں میں جیتی ہیں۔ جھمی کو اپنا جیون ساتھی بھی تو تلاش کرنا تھا۔ جھمی کو اس بات کا علم نہ تھا کہ گینی نے جیون ساتھی بننے یا تلاش کرنے کے متعلق نہیں سوچا۔

گینی تو گڈ ٹائم اور اڈونچر کا متلاشی تھا۔ جب وہ جھمی کے مجبور کرنے پر ایور گرین میں صدر دروازے سے داخل ہوا تو ایڈونچر کا عنصر ہی ختم ہو گیا۔ اڈونچر تو ہمیشہ عقبی دروازے سے متعلق ہوتا ہے۔ باقی رہا گڈ ٹائم تو آپ جانتے ہیں گڈ ٹائم میں تنوع کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ ایک ہی سُر دبائے رکھنے سے نغمہ نہیں بنتا۔

اس لیے جوں جوں دن گزرتے گئے ٹائم میں گڈ کا عنصر بتدریج کم ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ صرف ٹائم ہی ٹائم رہ گیا اور اس خالی خولی ٹائم سے اکتا کر گینی ہمیشہ کے لیے روپوش ہو گیا۔

گینی کی روپوشی پر جھّی ساری کی ساری الٹ پلٹ ہو کر رہ گئی۔ چونکہ وہ گڈ ٹائم کی قائل نہ تھی۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے کیا نہ کرے۔ اسے پتہ نہ تھا کہ ان حالات میں ماڈرن گرل کو کیا کرنا چاہیے۔ لہٰذا وہ بگی بگی اپنے کمرے میں پڑی رہتی۔

پھر وقار محل کی ٹھکا ٹھک نے اسے گھیر لیا وہ ٹھک ٹھک اس کے جسم میں دھنس گئی۔ اندر جا کر تالیاں بجانے لگی۔ اسے اکسانے لگی۔ اُٹھو۔ کچھ کرو۔ اُٹھو کچھ کرو۔ اٹھو کرو ٹھک ٹھک۔ اُٹھو کرو ٹھک ٹھک۔

ماڈرن گرل ہونے کے باوجود جھّی کو جسم کے تقاضوں کے متعلق کچھ پتہ نہ تھا۔ جب وہ گینی سے ملا کرتی تھی تو اسے یہ احساس نہ تھا کہ وہ جسم کا تقاضہ پورا کر رہی ہے۔ اس نے تو ان جانے میں گینی کو جیون ساتھی بنا لیا تھا۔ اسے گینی سے محبت ہو چکی تھی۔

جب گینی چلا گیا تو بات ہی ختم ہو گئی پھر محل کی کھٹ کھٹ اس کی رانوں میں کیوں گونجتی تھی۔ گھڑی کیوں چلتی تھی۔ جبھی تو وہ پریشان تھی۔ کئی ایک دن وہ پریشان رہی۔

پھر ان کے گھر میں حسنی آ گیا اور مزید پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔

حسنی ان کا نیا بوائے سرونٹ تھا چھٹپنے سے ہی وہ کوٹھیوں میں کام کرتا رہا تھا۔ وہیں جوان ہوا تھا۔ ماڈرن بیگمات کے انداز دیکھ دیکھ کر وہ وقت سے پہلے جوان ہو گیا تھا۔ حسنی خاصہ اپ ٹو ڈیٹ تھا۔ کلین شیو۔ سمارٹ لک۔ لمبے بال۔

جھّی نے حسنی کی آمد کا نوٹس نہ لیا۔

نوکر تو گھر میں آتے جاتے ہی رہتے ہیں۔ کبھی خانساماں چلا گیا کبھی بوائے سرونٹ آ گیا۔ گینی کی روپوشی کے بعد ان دنوں جھّی کی طبیعت ناسازسی رہتی تھی۔ اس روز اس نے چائے اپنے کمرے میں منگوالی۔

حسنی پیالی بنا کر کمرے میں لے گیا۔ جب وہ جھّی کو پیالی دینے کے لیے جھکا تو اتفاقاً جھّی نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ پتہ نہیں کیا ہوا۔ حسنی کے کلین چہرے پر دو

مونچھیں ابھر آئیں وہ لٹکنے لگیں۔ گھبراہٹ میں ہٖمی کے منہ سے نہ جانے کیا نکلا۔ حسنی اسے سمجھ نہ سکا۔ بولا۔ جی؟ ہٖمی کو ایسے محسوس ہوا جیسے کسی نے ہائی کہا ہو۔ اس کا سر سرہانے پر گر پڑا۔ حسنی کے ہاتھ سے پیالی چھوٹ گئی۔ لیکن چائے تو بستر پر گری تھی۔ ہٖمی کیوں شرابور ہو گئی تھی۔

پھر یہ مشکل روز کی مشکل بن گئی۔

جب بھی حسنی ہٖمی کے کمرے کا دروازہ کھول کر آہستہ سے کہتا۔ جی تو اسے محسوس ہوتا جیسے کسی نے ہائی کہا ہو۔ وہ چونک کر مڑ کر دیکھتی۔ اس وقت حسنی کے کلین شیو چہرے پر مونچھیں لٹک جاتیں اور چٹے سفید دانت چمکتے۔ صورتِ حال یہاں تک آ پہنچی کہ ہٖمی حسنی سے ڈرنے لگی۔

اوّل تو ہٖمی اپنے آپ سے بھی تسلیم نہیں کرتی تھی کہ وہ حسنی سے ڈرتی ہے اسے علم نہ تھا کہ وہ خود سے ڈر رہی ہے۔ حسنی کو اچھی طرح علم تھا کہ وہ ڈرتی ہے حسنی کوٹھیوں میں کام کرتے کرتے جوان ہوا تھا۔ وہ ماڈرن گرل سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ انہیں سمجھتا نہیں تھا لیکن جانتا تھا اور سمجھے بغیر جاننا۔ جانے بغیر سمجھنے سے کہیں بہتر ہوتا ہے۔ بہر حال حسنی کو پتہ تھا کہ جب مس صاحبہ ڈرنے لگے تو وہ ڈر صرف سٹیٹس کا ڈر ہوتا ہے۔ اور سٹیٹس کا ڈر ایسی بیل ہوتی ہے جس کی جڑ نہیں ہوتی۔ اس لیے وہ انتظار کرتا رہا۔ حسنی بار بار بہانے بہانے ہٖمی کے کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھولتا اور پھر مدہم مگر پُر لَے آواز میں کہتا۔ جی۔۔۔ آپ نے بلایا مس صاحب۔

ایک روز جب ہٖمی آئینے کے سامنے کھڑی تھی تو حسنی نے وہی حرکت دہرائی۔ ہٖمی گھبرا کر پیچھے ہٹی۔ اس کے قدم لڑکھڑائے۔ وہ گری۔ دو مضبوط بانہوں نے اسے سنبھال لیا۔ ہٖمی نے اوپر کی طرف دیکھا۔ دو لٹکی ہوئی مونچھوں میں چٹے سفید دانت چمک رہے تھے۔ ہٖمی نے آنکھیں بند کر لیں اس ڈر کے مارے کہ کہیں مونچھیں اُڑ نہ جائیں نیچے سے کلین شیو چہرہ نہ نکل آئے۔ پھر، پھر اسے یاد نہیں۔

ٹھک ٹھک ٹھک وقار محل کی دیواریں ٹوٹ رہی تھیں۔ سنہرا گرد و غبار اُڑ رہا تھا۔

اگرچہ بھی نے اپنی عزت کا تحفظ کرنے کے لیے کلین شیو چہرے پر مونچھیں لگالیں تھیں۔ اور یوں اپنے ذہن کو مطمئن کر لیا تھا۔ لیکن جسم کو وہ کیسے سمجھاتی۔ جسم تو ایک بے سمجھ کہہ دینے والا دہقان ہے۔ وہ ذہن کی سیاست دانیوں کو نہیں سمجھتا۔ جھوٹے رکھ رکھاؤ کی ہیرا پھیریوں کو نہیں جانتا۔ عذاب اور ثواب کے فلسفے کو نہیں مانتا وہ قدیم اور جدید کے امتیازات کو تسلیم نہیں کرتا۔ جسم غلیظ سہی لیکن مکار نہیں۔ وہ صاف بات کرتا ہے۔ دوٹوک بات۔ سیدھی بات۔

جسم نے بھی کے کان میں بات کہہ دی کہ تھرل صرف گینی سے ہی وابستہ نہیں۔ مونچھیں لگانے کے تکلف کے بغیر بھی تھرل حاصل ہو سکتی ہے۔ جسم کی یہ زیر لبی بھی کو بہت ناگوار گزری۔

اگلی صبح جب دھندلکا دور ہوا اور سٹیٹس کی دُنیا پھر سے آباد ہوئی تو بھی کی انا کو بڑا صدمہ ہوا۔ یہ میں نے کیا کر دیا۔ یہ کیسے ہو گیا۔ ایک معمولی نوکر۔

سارا دن وہ اپنی نظر میں گرتی رہی۔ گرتی ہی چلی گئی۔ سارا دن وہ کوشش کرتی رہی کہ اپنے آپ کو سنبھالے۔ لیکن اس روز گویا یاسمین اس کے دل میں آ گھسی تھی۔ بھی اور یاسمین برسرِ تکرار تھیں۔

بھی بار بار کہتی۔ چلو ہو گیا ہے تو پھر کیا ہوا۔ اتنی چھوٹی سی بات پلّے نہ باندھو۔

یاسمین کہتی اُونہوں بات پلّے باندھی نہیں جاتی وہ تو بن پوچھے، بن سوچے سمجھے آپ ہی آپ پلّے بندھ جاتی ہے۔

بھی کہتی۔ دل میلا نہ کرو۔ تم تو ایک ماڈرن گرل ہو جنس تو ایک ذاتی معاملہ ہے اسے روگ نہ بناؤ۔

یاسمین کہتی۔ تم ماڈرن گرل نہیں ہو۔ کوئی بھی ماڈرن گرل نہیں ہے۔ سبھی ماڈرن گرل بننا چاہتی ہیں۔ چاہنے اور ہونے میں بڑا فرق ہے۔

اس روز سارا دن بھی اور یاسمین میں کشمکش ہوتی رہی۔ سارا دن اس کے دل کی ہنڈیا میں بھی اور یاسمین کی کھچڑی پکتی رہی۔

ڈِھی اور یاسمین کے جھگڑے، بے کو سُن سُن کر اس کے کان پک گئے۔ وہ محسوس کرتی تھی جیسے وہ ان دونوں سے الگ تھلگ ہو۔

دفعتاً اس کے ذہن میں خیال اُبھرا۔ پھر میں کون ہوں کیا میں یاسمین ہوں۔ نہیں میں یاسمین نہیں کیا میں ڈِھی ہوں۔ نہیں میں ڈِھی نہیں۔ تو پھر میں کون ہوں۔

صرف میں ہی نہیں ڈیڈی بھی تو ہیں۔ کیا ڈیڈی محمد عثمان ہیں۔ نہیں۔ کیا وہ ایم اوثمان ہیں نہیں تو پھر ڈیڈی کون ہیں۔

اس گھر میں صرف ایک فرد ممی تھی۔ جو فاطمہ بیگم تھیں خالی فاطمہ بیگم۔ جنہیں سب ممی کہتے تھے نہ جانے کب سے کہہ رہے تھے۔ جنہیں برسوں سے ممی بنانے کی کوششیں کی جا رہی تھیں۔ لیکن وہ امی تھیں اور امی ہی رہی تھیں۔ گھر میں صرف وہی تھیں جنہیں علم تھا کہ وہ کون ہیں۔

میں کون ہوں، یہ ایک بڑا ٹیڑھا سوال پندرہ برس تک وہ سمجھتی رہی تھی کہ وہ یاسمین ہے۔ دو سال تک وہ سمجھتی رہی تھی کہ وہ جسمن ہے اور گزشتہ چار سال سے وہ سمجھ رہی تھی کہ وہ ڈِھی ہے لیکن آج وہ اپنے آپ سے پوچھ رہی تھی کہ میں کون ہوں۔ آج اس کے دل میں ڈِھی اور یاسمین کی کھچڑی پک رہی تھی۔

کیا میں ڈِھی اور یاسمین کی کھچڑی ہوں۔ نہیں، نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ میں کھچڑی نہیں ہوں۔ میں کبھی کھچڑی نہیں بنوں گی۔ میری ایک شخصیت ہے۔ میرا ایک سلف ہے۔ میں یاسمین نہیں بن سکتی ڈِھی بن سکتی ہوں لیکن کھچڑی نہیں کبھی نہیں۔ کبھی نہیں۔

اس کے سامنے افعی آ کھڑی ہوئی۔ میں افعی ہوں وہ سینہ اُبھار کر بولی۔ خالص افعی نہیں یہ جھوٹ بولتی ہے۔ یاسمین نے کہا اگر یہ افعی ہوتی تو کبھی گھر چھوڑ کر نہ جاتی۔

اس چیخ سے گھبرا کر ڈِھی اُٹھ بیٹھی اور کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی سامنے وقار محل کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ حسرت آلود تھی۔

ڈِھی نے محسوس کیا جیسے محل سب کچھ جانتا ہو۔ ٹھک ٹھک کھچ۔ ڑی ٹھک ٹھک۔ کھچ ڑی محل کی دیواریں چلا رہی تھیں۔

نہیں تم بِھّی ہو۔ بِھّی ۔اس کے دل سے آواز آئی ۔اس واقعہ کو بھول جاؤ۔

نہیں نہیں یاسمین بولی۔ بُھولنا کافی نہیں۔ تمہیں اس داغ کو اپنے دامن سے دھونا ہو گا۔

ٹھک ٹھک ٹھک ٹوٹتے ہوئے محل کی آوازیں بِھّی کے کمرے میں گونج رہی تھیں۔ ٹک ٹک ٹک ایک لرزش اس کے اندر رینگ رہی تھی۔

نہیں نہیں بِھّی گھبرا کر بولی تم ایک ماڈرن گرل ہو، نہیں نہیں یاسمین چلاّئی تم وقار محل کے سائے میں پل کر جوان ہوئی ہو۔

ٹھک ٹھک ٹھک ٹوٹتا ہوا محل کراہ رہا تھا۔ دفعتاً اس کا منہ سرخ ہو گیا۔ حسنی اس نے یوں آواز دی جیسے ڈوبتی ہوئی کشتی میں سے کوئی مدد کے لیے چلاّ رہا ہو۔ حسنی۔

بِھّی اور یاسمین دونوں ششدر رہ گئیں۔ یہ آواز کس نے دی کس نے؟

حسنی ۔وہ پھر چلاّئی۔

وہ آواز منہ سے نہیں بلکہ جسم سے نکل رہی تھی۔

-☆-

بُت، دیوتا اور سنّاٹا

تراخ۔۔۔ایک دھچکا لگا۔۔۔جیسے کچھ ٹوٹ گیا۔۔۔گردوپیش کی آوازیں مدہم پڑتی گئیں۔مدھم پڑتی گئیں۔۔۔ارے میں تیر رہا تھا۔بے لہر سمندر میں تیر رہا تھا۔تیرتا رہا۔تیرتا رہا۔۔۔ایک گرداب مجھے کھینچ رہا تھا۔ٹیالی سپیدی ختم ہوتی جا رہی تھی۔۔۔کالا بولا اندھیرا۔۔۔میں ایک کنوئیں میں گر رہا تھا۔گرا جا رہا تھا۔گرتا رہا۔گرتا رہا۔صدیاں بیت گئیں۔وقت تھم چکا تھا۔میں لاوقت ہو چکا تھا۔

ہوش آیا تو میں ایک وسیع نیلگون دھندلکے میں ڈھیر ہوا پڑا تھا۔حرکت کی سکت نہ رہی۔پھر جیسے روشنی کی ایک کرن مجھ پر پڑی۔اس میں نمو تھی۔زندگی تھی!کرن قریب آتی گئی۔اور قریب۔اور قریب۔میں نے آنکھ کھولی۔میرے رُوبرُو ایک چہرہ تھا۔منور چہرہ۔۔۔میں اُٹھ بیٹھا۔پھر سے بے لہر سمندر میں تیرنے لگا۔

وہ ایک دھندلا دھندلا وسیع میدان تھا۔سامنے ایک عظیم ہیبت ناک قلعے کے دو ڈراؤنے بُرج نظر آ رہے تھے۔میدان میں بہت بڑا ہجوم تھا۔یہ کون سی جگہ ہے میں نے خود سے بات کی۔کچہری ہے۔ایک مدہم سی آواز آئی۔

میں نے تو کسی پر مقدمہ نہیں کیا۔

کسی نے بھی نہیں کیا۔

پھر یہ سب یہاں کیوں آئے ہیں۔

یہاں آنا ہی پڑتا ہے۔

میں تو یہاں رُکنا نہیں چاہتا۔

نہ رکو۔ چلے جاؤ۔

کوئی پوچھے گا تو نہیں۔

اُونہوں۔ کوئی نہیں پوچھے گا۔ لیکن۔۔۔

لیکن کیا۔

لیکن تمہیں اک دن آنا ہی پڑے گا۔

وہ پکڑ کر لے جائیں گے کیا؟

نہیں۔ تم از خود آؤ گے۔ اپنی مرضی سے۔

اپنی مرضی سے۔۔۔؟

ہاں۔ آ کر کہو گے میں حاضر ہوں۔ میرا حساب چکایا جائے۔

دفعتاً بُرج پر لگا ہوا لاؤڈ سپیکر بولا۔ توجہ توجہ۔

سب کے کان کھڑے ہو گئے۔ سناٹا چھا گیا۔

جہانگیر فرزند خاتون بیگم۔ لاؤڈ سپیکر غرّایا۔

میں چونکا یہ تو میرا نام ہے۔

تم بڑے خوش قسمت ہو۔ چار ایک آوازیں آئیں۔ یہاں تو لوگ نہ جانے کب سے گوش بر آواز بیٹھے ہیں۔ کہ کب آواز پڑے۔

پھر دفعتاً منظر بدل گیا۔ میں ایک اور چوگان میں تھا جہاں چاروں طرف بڑے بڑے پتھر پڑے ہوئے تھے۔ اور دُودھیا سویرا چھایا ہوا تھا۔ وسیع و عریض میدان میں، مَیں اکیلا تھا۔ سامنے وہی بُرج ایستادہ تھے ہیبت ناک وہاں اکیلے بیٹھے بیٹھے میں سوچنے لگا۔ میں کہاں آ گیا ہوں۔ کیا یہ دوسری زندگی ہے۔

اُونہوں پیچھے سے آواز آئی۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔ میرے پیچھے ایک روشن مدبّر چہرہ تھا۔

زندگی نہ پہلی ہے نہ دوسری بلکہ ایک تسلسل ہے۔

کیا یہ دوسرا جہان نہیں مَیں نے پوچھا۔

نہیں وہ بولا۔ بہت سے آسمان ہیں زمینیں ہیں لیکن جہاں ایک ہی ہے۔

مجھے آواز پڑی تھی نا۔

ہاں پڑی تھی۔

لیکن یہاں کوئی پوچھتا نہیں۔۔۔ کیوں؟

پوچھنے والے کی مرضی۔

یہ میدان خالی کیوں ہے؟

خالی تو نہیں۔

بڑے بڑے پتھر پڑے ہیں اور بس۔

پتھر نہیں ہیں۔

پھر جو میں نے غور سے دیکھا تو وہ پتھر نہیں تھے۔ بُت تھے۔ اتنے سارے بُت۔ بُت ہی بُت۔ بُت ہی بُت۔ کچہری میں بُتوں کا کیا کام۔ کیوں۔ کس لیے۔

یہاں کیوں کس لیے نہیں پوچھا جاتا۔ یہ گستاخی ہے۔

میں نے مُڑ کر دیکھا۔ آپ ہیں کون؟

میں ٹرائل اسسٹنٹ ہوں۔

کیسا ٹرائل۔

تمہارا ٹرائل۔

میرا ٹرائل ہوگا۔ کس بات کا؟

ہر بات کا۔

آپ جج ہیں کیا۔

نہیں وہ بولا میں رابطہ افسر ہوں۔

میں نے تو زندگی میں کچھ نہیں کیا۔ کچھ نہیں۔ کسی کا برا نہیں چاہا۔ کسی کو دھوکا نہیں دیا۔ کسی کا حق نہیں مارا۔۔۔

نہ کرنا عمل نہیں۔ یہاں صرف عمل جانچتے ہیں۔ کہ کیا کیا۔ کیا یہ نہیں کہ کیا نہیں کیا۔

میں نے محبتیں ضرور کی تھیں۔ چار ایک۔ ان میں نا جائز بھی تھیں۔

محبت کرنا جرم نہیں۔

سچ۔ لیکن ان میں نا جائز جو تھیں۔

محبت محبت ہوتی ہے۔ نہ جائز ہوتی ہے نہ نا جائز۔

لیکن میری خواہشات پاکیزہ نہ تھیں۔

خواہشات عمل نہیں ہوتیں۔

تم یقین سے کہہ رہے ہو۔

ہاں یہی یہاں کا قانون ہے۔

جج کہاں ہے میں نے پوچھا۔

جج تم خود ہو۔

میں؟

ہاں تم۔

میں جج بھی ہوں مجرم بھی۔

ہاں تم مجرم بھی ہو۔ گواہ بھی اور جج بھی۔

میں حیرت میں ڈوب گیا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ دیر تک خاموشی طاری رہی۔ میں سوچتا رہا۔ سوچتا رہا۔

دفعتاً میرے رُوبرُو ایک حسین جاذبِ نظر متبسم چہرہ اُبھرا۔ وہ چہرہ بہت مانوس تھا۔ بے حد مانوس۔

ارے یہ تو سفینہ ہے۔

پہچان لیا تم نے رابطہ افسر بولا۔

ہاں۔۔۔ یہ میری سفینہ ہے۔ میری پہلی محبت۔ میری نوجوانی کی ویرانے میں پہلا ۔۔تان۔

پتہ نہیں اس وقت مجھے کیا ہوا۔ سفینہ کو دیکھ کر بیتے ہوئے جذبات پھر سے اُبھر آئے۔

جذبات کا وہی طوفان جس سے میں پچاس سال پہلے سرشار تھا میں بھول گیا کہ کہاں ہوں کس کے حضور کھڑا ہوں۔ جوش میں، مَیں بولے گیا، بولے گیا۔

یہ وہ سفینہ ہے جس کے ساتھ میں نے ٹوٹ کر محبت کی۔ اس کے قدموں پر اپنا سر جھکائے رکھا، جھکائے رکھا۔۔۔ ۱۶ سال۔ اس کے پاؤں پر اب بھی میرے سجدوں کے نشان موجود ہیں۔ سولہ سال میرے جسم کا انگ انگ۔ روح کا ذرّہ ذرّہ اس کی طرف متوجہ رہا۔ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے چلتے پھرتے ہر آن، ہر لحمہ میں اس پر نثار ہوتا رہا۔ میں نے اپنی ذات کو اس میں فنا کر دیا۔ یہ بُت تھی اور میں بُت پرست تھا۔ پجاری تھا۔ یہ چلتی تو اس کی چال میں لَے نظر آتی۔ بیٹھتی تو اس کے پوز میں حُسن ہی حُسن محسوس ہوتا۔ بولتی تو چاندی کی گھنٹیاں بجتیں۔

سولہ سال میں نے اس دیوی کو مناما کر گزار دیئے۔ میری ہر نگاہ میں آرتی کے پھول ہوتے۔ میری سوچ کا ہر زاویہ اس کی سمت لے جاتا۔

دفعتاً میں رُک گیا۔ رابطہ افسر سر جھکائے کھڑا تھا۔ سفینہ کے ہونٹوں پر تبسّم کھیل رہا تھا۔

میری محبت میں صرف ایک خامی تھی۔ میں نے کہا۔ میری محبت جائز نہ تھی۔ مجھے اس سے محبت کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔ یہ کسی اور کی ہو چکی تھی۔ میں نے پہلی بار اسے اس وقت دیکھا جب یہ دلہن بن کر ہمارے محلے میں آئی تھی۔ ڈولی سے باہر نکلی تھی۔ اس کا پور پور زندگی سے منور تھا۔ محلے کی لڑکیوں میں یہ یوں تھی جیسے کیکر کے پھولوں میں چنبے کی بوٹی ہو۔ اُسے دیکھ کر محلے کے نوجوانوں کے دیدے پھٹ گئے۔ اسے نگاہوں نے گھیر لیا۔ نگاہوں پر ایسی چڑھی۔ اس قدر جھلائی گئی کہ نگاہوں پر جھولنا اس کا مقدر بن گیا۔ دفعتاً مجھے ہوش آیا کہ میں کہاں کھڑا ہوں۔

اس سے پوچھ لیجیے میں نے رابطہ افسر سے کہا میں جھوٹ نہیں بول رہا۔

ہاں سفینہ بولی۔ یہ سچ ہے کہ میں نگاہوں پر چڑھی۔ جُھلائی گئی۔ آرزوؤں کا مرکز بنی۔ میرے اردگرد بُت پرست ہی بُت پرست تھے۔ انہوں نے مجھے بُت بنا لیا۔

واقعی اس شخص نے ٹوٹ کر محبت کی۔ سجدے بچھائے۔ اس شخص کو توجہ کی ایسی صلاحیت ملی ہے جو عورت کو پاگل کر دیتی ہے۔ رنگین توجہ۔ اٹوٹ توجہ۔ خوفناک توجہ۔ اس نے میرے ارد گرد توجہ کا ایک سنہرا جال بُن دیا۔

بے شک اس نے ٹُوٹ کر محبت کی لیکن اس کی محبت دینے والی محبت نہ تھی، لینے والی محبت تھی۔ خود کو معدوم کرنے والی محبت نہ تھی۔ دوسرے کو زیر اثر کرنے والی محبت تھی۔ اس کی محبت میں تیاگ نہ تھا۔ شوکتِ نفس تھی۔

کیا کیا کیا غصے سے میں چلاّیا۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔

شوکتِ نفس محبت نہیں ہوتی۔ رابطہ افسر گنگنایا۔

بولو میں جھوٹ کہتی ہوں کیا سفینہ نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ چلاّ چلاّ کر کہوں بالکل جھوٹ میں جواب دینے ہی والا تھا کہ مجھ میں سے وہ نکل کر میرے رُوبرُو آ کھڑا ہوا۔ اسے دیکھ کر میں ہکاّ بکاّ رہ گیا۔ وہ میں ہی تھا میں خود۔

اس شخص نے بلاشبہ ٹوٹ کر محبت کی۔ اس نے میری طرف اشارہ کر کے کہا۔ لیکن اس نے سفینہ سے محبت نہیں کی۔

سفینہ وہ بولا ایک حوالہ تھی۔ ایک بہانہ تھی۔ ایک پردہ تھی دراصل اسے اپنی بھابھی سے محبت تھی۔ اس کی بھابھی حسین تھی شوخ تھی طرحدار تھی۔ جس کے گھر میں یہ پرورش پاتا رہا تھا بھابھی سے محبت کا اظہار ممنوع تھا۔ ناجائز تھا۔ یہ خود سے اس کا اعتراف نہیں کر سکتا تھا۔۔۔ پھر منظر پر سفینہ آ گئی۔ اور یہ شخص:۔ غیر کے پاؤں پڑ گیا بے خودی نیاز میں۔ بھابھی دیوی تھی۔ سفینہ بُت تھی۔ اس نے خود کو دھوکا دیا۔ سفینہ کو دھوکا دیا۔ بھابھی کو دھوکا دیا۔ سولہ سال کا مسلسل دھوکا۔

جھوٹ سراسر جھوٹ میں چلاّیا۔ تم کون ہو۔ جو میری ہی شکل میرے ہی رُوپ میں میرے سامنے آ کھڑے ہوئے ہو۔

یہ گواہ ہے رابطہ افسر بولا۔ یہ تمہارے اندر کا سچ ہے۔ میں وہ ہوں۔ گواہ بولا۔ جسے تم نے ساری زندگی بولنے نہ دیا۔ اس لیے کہ سچ کا سامنا کرنے کی تم میں ہمت نہ تھی۔ تم نے

خود کو رنگین فریبوں میں مبتلا رکھا۔ کچھ دیر کے لیے وہ رُک گیا پھر بولا۔ تم نے خود کو کبھی ایسے نہیں دیکھا جیسے کہ تم ہو بلکہ ہمیشہ ایسے دیکھا جیسے تم خود کو دیکھنا چاہتے تھے۔

لیکن لیکن میں چلاّیا سفینہ اور میری محبت تو رسوائے عالم تھی اور۔۔۔

ہاں سفینہ بولی ہم دونوں رسوائے عالم تھے۔ تمہاری پاگل کر دینے والی توجہ نے میرا سب کچھ چھین لیا۔ میرا خاوند۔ میرے بچے۔ محلے والوں کی خوشنودی۔ یہاں تک کہ خود مجھے مجھ سے چھین لیا۔

کیا تم معصوم ہو۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہ تھا میں نے غصے میں پوچھا۔

میں ایک عورت ہوں وہ بولی مجھ میں ہر بات کا مقابلہ کرنے کی ہمت ہے لیکن میں محبت بھری توجہ کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ مرد کی توجہ۔ چاہے وہ سچی ہو جھوٹی ہو۔ پردہ ہو یا دکھاوا۔ پاکیزہ ہو یا ہوس بھری اس کے زیرِ اثر مَیں یوں پگھل جاتی ہوں جیسے مکھن چولہے کی حدّت میں پانی ہو جاتا ہے۔ پھر وہ رابطہ افسر سے مخاطب ہو کر بولی۔ اس شخص کے پاس خوفناک قسم کی توجہ ہے۔ جو بند بند میں اُتر جاتی ہے چیونٹوں کی طرح چڑھ جاتی ہے۔ کھا جاتی ہے۔ اس کی توجہ نے مجھے کھا لیا۔ کھوکھلا کر دیا۔

گواہ آگے بڑھ کر بولا۔ اس کے پاس توجہ کے سوا کچھ نہیں کچھ نہیں۔ توجہ کا یہ گلدان محبت کے گلدستے سے خالی ہے۔ محبت دینے کا عمل ہے۔ اس شخص میں دینے کی صلاحیت مفقود ہے۔ یہ توجہ کا جال اس لیے بچھاتا ہے کہ پھانس لے جکڑ لے۔ اپنا بنا لے۔ حکمرانی کرے۔ یہ شخص کسی کی پوجا کیا کرے گا۔ یہ خود بُت ہے شوکتِ نفس نے اسے بُت بنا رکھا ہے۔

گرد و پیش میں حرکت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مسلسل حرکت۔ مجھے ایسا لگا جیسے چوگان میں پڑے ہوئے بتوں نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا۔ ان کے ہونٹ ہلے سارے چوگان میں ایک سرگوشی گونجی۔ بُت بُت۔ میں نے شرم سے گردن جھکا لی۔ پتہ نہیں کتنی دیر ویسے ہی بیٹھا رہا۔ پھر قدموں کی آہٹ سن کر میں نے سر اُٹھایا۔ میرے رُو برُو سعدیہ کھڑی تھی۔ سعدیہ میری محبوبہ۔ وہی متبسم آنکھیں۔ شرارت سے ادھ کھلے ہونٹ۔ وہی شوخی۔ بے

چینی۔اضطراب۔

اس نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی۔ چہرہ تمتما گیا۔نہیں نہیں۔ وہ رابطہ افسر سے مخاطب ہو کر بولی۔ میں اس شخص کی شکل دیکھنا نہیں چاہتی۔اس نے مجھ سے خوفناک قسم کا انتقام لیا تھا۔

نہیں نہیں میں چلایا میں نے تو تم سے محبت کی تھی۔

میں بھی یہی سمجھتی تھی کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔ پھر دفعتاً وہ ہٹ گیا اور میں نے دیکھا کہ تم محبت کی اوٹ میں مجھ سے انتقام لے رہے ہو۔کتنا خوفناک انتقام تھا۔

پھر وہ رابطہ افسر سے مخاطب ہو کر بولی مجھے ایک خوبصورت اونچے لمبے شخص سے محبت تھی۔اس کا نام جاہ تھا۔یہ شخص جاہ کا راز دان تھا۔ جب جاہ اسے پہلی بار ہمارے سامنے لایا تو میں نے صاف صاف کہہ دیا نہیں نہیں۔ ہمیں اس کالے کلوٹے ٹھگنے شخص سے کوئی سروکار نہیں لے جاؤ اسے لے جاؤ۔ لیکن جاہ کا اس کے بغیر گزارہ نہ تھا۔اس لیے وہ اسے اپنے ساتھ لانے لگا۔ پھر اس نے اپنی باتوں کا جال بچھایا۔ اُف اس کی باتیں۔اتنی رنگین اتنی رس بھری اتنی حاضر جوابی۔ باتوں سے موہ لینے کے بعد اس نے اپنی توجہ مجھ پر مرکوز کر دی میں اس کی توجہ سے پاگل ہو گئی۔ جاہ کو بھول گئی۔ گھر والوں کو بھول گئی۔سبھی کچھ بھول گئی۔ یہ بُت بن گیا اور میں پجاری۔ پھر دفعتاً وہ سرک گیا۔اور۔اور میں نے دیکھا کہ محبت کے پردے میں یہ مجھ سے انتقام لے رہا ہے۔ چونکہ میں نے اسے کالا کلوٹا کہہ کر رد کیا تھا۔ مجھے ایک دھچکا لگا۔خوفناک دھچکا۔سب اُتھل پتھل ہو گیا۔۔۔ پھر وہ مجھے پاگل خانے لے گئے اور میں پاگل رہی مہینوں پاگل رہی۔نہیں نہیں میں اس شخص کی شکل دیکھنے کی روادار نہیں اسے دیکھ کر مجھ پر وہی وحشت سوار ہو جاتی ہے۔نہیں نہیں نہیں کہتی ہوئی وہ اُلٹے پاؤں چلنے لگی۔

میں نے محسوس کیا جیسے تمام بتوں نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا۔ان کے ہونٹ ہلے اور چوگان میں وہی سرگوشی گونجی۔ بُت۔ بُت۔ شرمسار ہو کر میں نے سر جھکا لیا۔ جھکائے رکھا، جھکائے رکھا۔ پھر جو میں نے سر اُٹھایا تو میرے سامنے آصفہ کھڑی تھی۔اس کی محبت بھری نگاہیں مجھ پر گڑی ہوئی تھیں۔اس کے حزن و ملال بھرے چہرے پر خوشی بھرا

تبسم تھا۔

ہاں وہ بولی انہوں نے مجھ سے سچی محبت کی اتنی والہانہ محبت کی کہ میرے اندر شمعیں روشن ہو گئیں۔ ان کی محبت نے مجھے زندگی سے آشنا کر دیا۔ میرا تن من منور کر دیا۔ وہ رُک گئی۔ جذبات کی شدت نے اس کی آواز بند کر دی۔

اگرچہ، آصفہ نے کہا حالات ہم دونوں کے درمیان دیوار بن کر کھڑے ہو گئے اور ہم نہ مل سکے۔ لیکن میں نے ان کے خیال میں ساری زندگی تنہائی میں گزار دی ساری زندگی۔ پھر بھی کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں محبت کے وہ روشن لمحے جو انہوں نے مجھے عطا کیے انمول تھے۔ میں نے ساری زندگی ان کی روشنی میں گزاری ہے۔

یہ صاحب وہ بولی بڑے عظیم ہیں۔ انہیں محبت میں خود کو دینا آتا ہے۔ میں نے ساری زندگی ان کی پوجا کی ہے۔

مجھ میں سے نکل کر گواہ پھر میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔ وہ قہقہے لگا رہا تھا۔ تحقیر بھرے قہقہے۔ تم کتنی معصوم ہو آصفہ۔

نہیں نہیں آصفہ چلاّئی۔ میں ان کے خلاف ایک لفظ نہیں سنوں گی۔

اس شخص نے جان بوجھ کر تمہیں دھوکا دیا گواہ بولا۔ اس کی محبت جھوٹ تھی فریب تھی۔

آصفہ نے کانوں میں اُنگلیاں ٹھونس لیں۔ مت کہو، مت کہو وہ چلاّئی۔ اس قدر ٹوٹ کر محبت کرنے والا شخص فریبی نہیں ہو سکتا۔ جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ پجاری کے سامنے دیوتا کی نندا نہ کرو۔ نہ کرو۔ میں نہیں سُن سکتی۔ یہ کہتے ہوئے وہ پچھلے پیروں چلنے لگی اور چند ساعت میں نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

اسے کہتے ہیں محبت گواہ بولا۔ اور تم۔۔۔ تم اس نے میری طرف دیکھا۔ یاد ہے تمہیں۔۔۔ جب تم آصفہ سے ملے تھے۔ اس وقت وہ عالمِ شباب میں تھی اور تمہاری عمر ڈھل چکی تھی۔ اس وقت تمہارے دوستوں نے تم سے کہا تھا جناب آصفہ پر ڈورے نہ ڈالیے بے کار ہے۔ اب تمہارے تلوں میں تیل نہیں ہے اس بات پر تم ضد میں آ گئے تھے اور اپنا مان ثابت کرنے کے لیے تم نے اپنی توجہ سے آصفہ کی زندگی تباہ کر دی۔ کیا اسے محبت کہتے ہیں۔ تف

ہے تم پر۔

میں نے شرم سے گردن جھکالی۔

اس وقت ایک عجیب بات عمل میں آئی۔ میرے حلق سے ایک گمبھیر آواز بلند ہوئی، پُروقار، پُرہیبت۔ بُت۔

چوگان میں پڑے ہوئے تمام بتوں کی گردنوں میں حرکت ہوئی۔ ایک مدہم سی سرگوشی گونجی۔ بلند ہوتی گئی۔ اور بلند اور بلند حتیٰ کہ تمام گردو پیش گونجنے لگا۔ بُت بُت۔ بُت۔ بُت۔

میں نے محسوس کیا کہ میرا نچلا دھڑ پتھر کا بنا جارہا ہے۔ آہستہ آہستہ پتھر اُوپر کی طرف بڑھتا گیا بڑھتا گیا۔

یہ کیا ہو رہا ہے میں نے گھبرا کر رابطہ افسر سے پوچھا۔

وہ مسکرایا۔ بولا۔ تم نے خود فیصلہ سُنا دیا ہے۔ تمہارے فیصلے پر عمل درآمد ہو رہا ہے۔ اس عمل کو کوئی نہیں روک سکتا۔ کوئی نہیں روک سکتا۔

عین اس وقت ایک مہیب آواز آئی جیسے بادل کڑکتا ہے۔ سرگوشی بند ہوگئی۔ سناٹا چھا گیا۔ چھائے رہا، چھائے رہا۔ صدیاں بیت گئیں۔ سارا ماحول سہما ہوا تھا بے حس و حرکت تھا۔ خاموش۔ منتظر۔

پھر ایک پُرہیبت آواز آئی۔

ہم نے بندے تخلیق کیے تھے۔ لیکن وہ دیوتا بن بیٹھے۔

کیا ہمارے بندوں میں کوئی ایسا نہیں جو بندہ بن کر جیا ہو۔۔۔ بولو۔۔۔ جواب دو۔

جواب میں ایک گمبھیر سناٹا چھا گیا جو کائنات پر مسلّط و محیط ہوگیا۔

☆

مصنف کی دیگر کتب

لبیک | ہندیاترا | اسمارائیں

تلاش | اوکھے اولڑے | گڑیا گھر

ان کہی | اور اوکھے لوگ | گہما گہمی

پیاز کے چھلکے | رام دین | علی پور کا ایلی

گڈی کی کہانی | کہی نہ جائے | الکھ نگری

غبارے | سمے کا بندھن | مفتیانے (اول)

نظام سقہ | روغنی پتلے | مفتیانے (دوم)

ممتاز مفتی کے ڈرامے | چپ

Title Design By: Agha Nisar 0300-4682971